افسانے

روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں

حیدر قریشی

افسانے

("روشنی کی بشارت" اور "قصے کہانیاں")

حیدر قریشی

معیار پبلی کیشنز

AFSANAY
(Short Stories)
By : Haider Qureshi

نام کتاب	:	افسانے (دو افسانوی مجموعے ''روشنی کی بشارت'' اور ''قصے کہانیاں'' ایک جلد میں)
مصنف	:	حیدر قریشی
کمپوزنگ، ڈیزائننگ	:	محمد عمر کیرانوی
اشاعت	:	1999ء
تعداد	:	600
مطبع	:	عزیز پرنٹنگ پریس، نئی دہلی
قیمت	:	ایک سو روپے

معیار پبلی کیشنز

کے۔۲۰۳، تاج انکلیو، گیتا کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۱ (انڈیا)

ترتیب

"روشنی کی بشارت" کے افسانے

''قصے کہانیاں'' کے افسانے

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"

روشنی کی بشارت

فن

"میں ایک مخفی خزانہ تھا
سو میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں
پس میں نے آدم کو تخلیق کیا"

(حدیث قدسی)

اظہار

بے حد عجز و انکسار،
تعظیم و تکریم اور
محبتوں کے ساتھ
کائنات کے سب سے قدیم اور سب سے عظیم تخلیق کار

ابلاغ

اپنے پیارے خدا کے نام

"وہ منشوں کے بھاؤ خیال سے بالا
دُنیا کو تخلیق کرنے والا پرماتما ہے"

(منو)

میں انتظار کرتا ہوں

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اُگے

میں سوتیلے جذبوں کے عذابوں سے گزرتا ہوں کہ مجھے اپنا سفر مکمل کرنا ہے۔
میں کسی صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔
اور ممتا کی ماری مری ماں پانی کی تلاش میں ہلکان ہوتی پھر رہی ہے۔
میں کسی اندھے کنوئیں میں گرا پڑا ہوں۔
اور مرے بھائی ان سوداگروں سے بھی مری قیمت وصول کر رہے ہیں جو کچھ دیر بعد مجھے اس کنوئیں سے نکالیں گے اور غلام بنا کر لے جائیں گے۔
میں کسی جنگل میں بن باس کے دن گزار رہا ہوں۔
مری بیوی مجھے ہرن کا شکار لانے کے لئے کہتی ہے۔ میں ہچکچاتا ہوں مجھے معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا مگر پھر میں بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

میں کہ سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

مری تاریخ کے سفر کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے "لچھمن ریکھا" عبور ہوتے ہی تاریخ کے سفر کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا ہے۔ میں کسی غیبی امداد کا منتظر ہوں۔

میں اندھے کنوئیں سے نکال لیا گیا ہوں۔

مگر میں ابھی تک اندھے کنوئیں میں ہوں کہ زلیخا مرے تعاقب میں ہے اور میں گناہ کے اندھے کنوئیں سے نکلنے کے لئے مسلسل دوڑ رہا ہوں۔

پیاس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

اور مری ماں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر چور ہو گئی ہے۔ ابھی تک پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے اس کے اپنے ہونٹوں پر بھی پیاس کی پپڑیاں جم گئی ہیں۔ مگر دور دور تک کسی قافلے کے آثار نظر نہیں آتے۔

مری بے گناہی۔۔۔ مری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔

میں اذیت میں ہوں کہ مری ماں ابھی تک مری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ جو بادشاہ زادی ہے۔ میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔

میں دکھ میں ہوں کہ حاکم کی بدکار بیوی مجھے میری نیکی کی کڑی سزا دلواتی ہے۔

میں قید میں ہوں کہ بدکاری کی تہمت مجھ پر عائد کر دی گئی ہے۔

اور مرا سینہ تنگ ہوتا ہے کہ میری پاک دامن بیوی پر بدکاری کا الزام عائد کیا گیا ہے۔

یہ سارے جھوٹے الزام اور تہمتیں وہی لگا رہے ہیں جو خود بدکار ہیں۔ جو مرے سوتیلے عزیز ہیں۔ وہ میرے گرد سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن جمع کر رہے ہیں تاکہ پھر اس میں نفرتوں کی آگ لگا کر مجھے بھسم کر ڈالیں۔

میں اس آگ سے بچنے کے لئے دعا کرتا ہوں کہ میں بے حد کمزور ہوں۔

☯

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برس سے انتظار کر رہی تھیں۔
اور میں وہی ہوں...... چاند، سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔
اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔
مگر میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میں سوچتا ہوں۔
میں کن امتحانوں آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزر رہا ہوں؟
مری پاکدامن بیوی کی صفائی کون دے کہ مرا واسطہ بدکاروں سے ہے جو اپنی برائیاں چھپانے کے لئے دوسروں پر تہمتیں عائد کرتے ہیں۔
اور مری اپنی صفائی کون دے کہ میں اب بھی گناہ پر آمادہ ہو جاؤں تو وہی عورت مری بے گناہی کی گواہی دے کر مجھے چھڑا لے جائے گی جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔
اور مری ماں...... بادشاہ زادی...... جو مری حالت نہیں دیکھ سکتی اور اس کی بے قراری دیکھ کر مرا اپنا دل خون ہوتا ہے اور میں پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ ایڑیاں رگڑنے لگتا ہوں۔ وہ کب تک پانی کی تلاش میں پہاڑیوں کا سفر کرتی رہے گی۔

☯

سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن میرے چاروں طرف جمع کیا جا چکا ہے اس ایندھن کے انبار پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔
وہ صحرا جس میں میں ابھی تک پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور مری

ماں پانی کی تلاش میں چکراتی پھر رہی ہے۔

اور وہ اندھا کنواں جس میں مجھے ڈالا گیا تھا اور وہ جیل جس میں میں اس وقت قید ہوں۔

اور وہ جنگل جس میں مجھے اپنے بن باس کے سارے دن گزارنے ہیں۔

سب اس ایندھن کے حصار میں آ گئے ہیں۔ ایندھن کے اس حصار کی دوسری طرف مرے سوتیلے عزیز جشن منا رہے ہیں، میری تضحیک کر رہے ہیں، قہقہے برسا رہے ہیں۔ اور وہ لمحہ قریب آتا جا رہا ہے جب وہ اس ایندھن میں نفرت کی آگ لگائیں گے۔

آگ چاروں طرف پھیل جائے گی۔ تب یہ صحرا، یہ اندھا کنواں، یہ جنگل اور میں ...... میری بے گناہی اور سچائی کے سارے نشان اس آگ میں جل کر فنا ہو جائیں گے۔ مٹ جائیں گے۔ اور میرے عزیزوں کے سوتیلے جذبوں کے ظلم کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔ تب مرے سوتیلے عزیز اپنی مرضی کے مطابق مری تاریخ لکھیں گے، تب وہ اطمینان سے لکھیں گے کہ:

میں بدکار تھا اور مری بیوی بھی بدکار تھی اور مری ماں لونڈی تھی ...... مگر مرا باپ؟

☯

میں پھر سوچنے لگتا ہوں

میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ ابراہیم کا بیٹا ہوں۔ اور میں جو جرم بے گناہی میں قید بھگت رہا ہوں، ابراہیم کا پوتا ہوں۔

اور میں جو جنگل میں بن باس کے دن کاٹ رہا ہوں۔ میں بھی ابراہیم کی آل سے ہوں کہ سچ کی راہ پر چلنے والے اور ظلم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے والے ابراہیم کی آل میں شمار ہوتے ہیں۔

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔
اور میں وہی ہوں۔۔ چاند سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔
اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔
میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
مرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا مسخ کرلیں مگر وہ مرے باپ کا نام کیوں کر مٹا سکیں گے۔ کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔
میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔
میں ابراہیم کا پوتا ہوں۔
میں آل ابراہیم سے ہوں۔
آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔
''آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔''
یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ مری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اور اس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔
مجھے جس اندھے کنوئیں میں گرایا گیا تھا آسمان سے اس میں اتنا پانی اترے گا کہ وہ کنواں چھلک پڑے گا اور بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا پانی سیلاب بن جائے گا۔
اور پھر سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کے ایندھن میں بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی ساری آگ بجھ جائے گی۔

☯

مرے سوتیلے عزیزوں نے نفرت کی آگ لگادی ہے۔ اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ مرے چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ سوتیلے جذبوں کی آگ...... مگر میں دیکھتا ہوں کہ:

مرے بن باس کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ میرا حق میرا تخت مجھے مل گیا ہے اور مری بیوی کی پاک دامنی کی شہادت خود تاریخ دے رہی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ:

مری قید کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ اور میں ایک اعلیٰ منصب پر سر فراز کیا گیا ہوں۔ اور چاند سورج اور ستارے مرے حضور سجدہ ریز ہیں۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ:

تپتے ہوئے صحرا میں مرے ایڑیاں رگڑنے سے ایک چشمہ پھوٹ بہا ہے مری ماں کے چہرے پر خوشیوں اور مسرتوں کا نور پھیلا ہوا ہے۔ وہ جو کسی قافلے کی امداد کی منتظر تھی اب ہزاروں قافلے اس کی مدد کے محتاج ہیں۔ اور اس بادشاہ زادی کو ایک نئی بادشاہت مل گئی ہے۔ اور ہزاروں برس سے مرا انتظار کرنے والی کنواریاں مرے گلے میں ڈالنے کے لئے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار سجائے مری آمد کے گیت گا رہی ہیں۔

اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی، آسمان سے اندھے کنوئیں میں اتر کر اور پھر باہر چھلک جانے والا پانی اور مری ایڑیوں کی رگڑ سے پھوٹ بہنے والے چشمے کا پانی...... سب مری آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔

سوتیلے جذبوں سے بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے اور اس آگ کے دوسری طرف مرے تمام سوتیلے عزیز حیرت اور خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔

میں آگ کے مکمل طور پر بجھنے کا انتظار کرتا ہوں۔

میں انتظار کرتا ہوں جب تھوڑی دیر بعد مرے سارے سوتیلے عزیز مجرموں کی طرح مرے سامنے پیش ہوں گے۔

اور میں اس وقت کے آنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

"لاتثریب علیکم الیوم......"

گلاب شہزادے کی کہانی

ہوا شہکار جب اس کا مکمل
وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

بے انت پھیلے ہوئے صحرا میں جب رات کا ایک پہر گزرنے کے باوجود کسی کو نیند نہ آئی تو چاروں درویش اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پہلے درویش نے تجویز پیش کی کہ رات کاٹنے کے لئے اپنی اپنی کوئی کہانی سنائی جائے۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور پہلے درویش سے کہا کہ وہ خود اپنی زندگی کی کسی کہانی سے ابتدا کرے۔

لمبے بالوں والا پہلا درویش آگے کو جھکا اور پھر یوں گویا ہوا:

"میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔

گلابی رنگ کو تم بخوبی پہچانتے ہو۔ خون سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ خون میں سفید رنگ ملادیں تو وہ گلابی بن جاتا ہے لیکن اگر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہو جاتا ہے۔

خیر تو میں کہہ رہا تھا...... میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔ لیکن اس کے لئے مجھے عملاً بتانا پڑے گا"

یہ کہہ کر پہلے درویش نے اپنے تھیلے سے گلاب کی ایک قلم نکالی اور اسے ریت میں گاڑ دیا۔

"میری کہانی کا باقی حصہ اس قلم کے بڑھنے تک ادھورا رہے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ باری باری اپنی کہانیاں سنالیں...... میں آخر میں اپنی کہانی مکمل کروں گا۔"

پہلے درویش کی اس بات پر دوسرے درویش نے اپنی کہانی شروع کی:

"میری کہانی عام سی ہے۔ میری بیوی نے اپنی آنکھوں کے جادو اور ہونٹوں کے منتر سے مجھے گدھا بنادیا تھا اور میں کئی صدیوں سے بوجھ اٹھاتا چلا آرہا تھا۔ پھر ایک دن مجھے بھی ایک اسم مل گیا۔ میں گدھے سے انسان بن گیا اور تب میں نے اپنے اسم کے زور سے اپنی بیوی کو گھوڑی میں تبدیل کر دیا۔"

تیسرا اور چوتھا...... دونوں درویش اس کی کہانی بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے جبکہ پہلا درویش گلاب کی اس قلم کو دیکھ رہا تھا جس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کانٹے سے چپکے ہوئے تھے...... قلم آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

"اب مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے تانگے میں جوت دیا تھا، گھوڑدوڑ کے کلب میں لے گیا تھا یا ویسے ہی اسے سرپٹ دوڑاتا رہا...... یا پھر پتہ نہیں وہ خود ہی سرپٹ دوڑتی رہی...... دوڑتی رہی......"

"پھر کیا ہوا"

تیسرے اور چوتھے درویش نے بڑے اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔

پہلا درویش ابھی تک گلاب کی اس بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا۔

"پھر؟" دوسرے درویش نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا۔

"پھر...... جب میری بیوی اپنی پہلی تنخواہ لائی تھی تو اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو

رہا تھا۔ اس نے اپنی آدھی تنخواہ گھر کے اخراجات میں ڈال دی اور بقیہ آدھی بچوں کے مستقبل کے لئے بنک میں جمع کرا دی اور پھر ہمیشہ ہی اس کا یہی طریق رہا۔ میری اور اس کی تنخواہ سے ہمارا گھر خاصا خوشحال ہو گیا۔ البتہ وہ اپنے باس کی بہت تعریفیں کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھتے تھے"۔

اچانک دوسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم پر پڑی جو اس عرصے میں حیرت انگیز طور پر دوگنی ہو چکی تھی اور اب اس میں ننھے ننھے سبز پتے بھی پھوٹ رہے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے کانٹوں میں لپٹی ہوئی گلاب کی پوری قلم کسی نے اس کے حلق میں ٹھونس دی ہو

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر بے اختیار پکارا۔ "پانی......!"

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کی قلم کچھ اور سرسبز ہو گئی اور سبز پتوں کے ساتھ ایک سرخ پتہ بھی ابھر آیا دوسرے درویش نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی تینوں درویشوں نے دیکھا کے بے انت پھیلے ہوئے صحرا نے خود کو خاصا سمیٹ لیا ہے۔

رات کا دوسرا پہر گزر چکا تھا

تیسرے درویش نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کہانی شروع کی:

جیسا کہ آپ جانتے ہیں تاریخ اور جغرافیے سے مجھے گہری دلچسپی ہے اور مرا تعلق بھی آثار قدیمہ سے ہے...... تین بچوں کی پیدائش کے بعد میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کروں۔ چنانچہ میں نے غبارے استعمال کرنا شروع کر دیئے...... مرا گھر خاصا چھوٹا اور تنگ سا ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ استعمال کے بعد میں نے غبارہ نالی میں پھینکنے کی بجائے کونے میں پڑی بڑی میز کے پیچھے پھینک دیا۔ میز کے نیچے پڑے ڈھیر سارے کباڑ میں وہ غبارہ چھپا رہتا۔ پھر کبھی خیال آتا تو اسے اٹھا کر نالی میں پھینک دیتا۔"

چوتھا درویش اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ایک دفعہ کسی کھنڈر سے کئی ہزار سالہ پرانی کھوپڑی دریافت ہوئی تو اس کے مطالعہ کے لئے مجھے بلایا گیا۔ کھوپڑی کے مطالعہ کے بعد جب میں گھر آیا تو اپنی میز کے نیچے کاٹھ کباڑ میں سے کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے مجھے ایک سوکھا ہوا تڑا مڑا سا غبارہ مل گیا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا...... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھوپڑی اس غبارے میں موجود ہو اور وہ کھوپڑی مرے اپنے بیٹے کی ہو۔''

چوتھا درویش اس کی کہانی میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

پہلا درویش گلاب کی اس مسلسل بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا جس میں سے اب شاخیں بھی پھوٹنے لگی تھیں۔

''میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے لگا میں نے اپنے بیٹے کو قتل کر کے اس کے سر کو محض کھوپڑی بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنا خوف بتایا۔ پہلے تو اس نے شور مچا دیا ''خاندانی منصوبہ بندی ختم نہیں کرنے دوں گی۔ مری صحت پھر تباہ ہو جائے گی'' لیکن بالآخر مرا خوف اس کی ضد پر غالب آگیا۔

جس دن اس نے مجھے خوشخبری سنائی...... مجھے یوں لگا جیسے ہزاروں برس پہلے کھو جانے والی مری کوئی قیمتی چیز مجھے دوبارہ ملنے والی ہے۔''

تیسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم کی طرف اٹھ گئی جو اَب گلاب کے چھوٹے سے پودے میں ڈھل گئی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے گلاب کا پودا اس کے اندر ہے اور کوئی اُسے اس کے حلق سے باہر کھینچ رہا ہے۔

وہ خوف سے چلایا، ''پانی......!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کا پودا کچھ اور پھیل گیا اس کے سبز پتوں میں ایک اور سرخ پتہ اُبھر آیا۔

تیسرے درویش نے خوفزدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی دونوں درویشوں نے دیکھا کے بے انت پھیلے ہوئی صحرا نے خود کو آدھا سمیٹ لیا ہے رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا۔

چوتھے درویش نے مشکوک نظروں سے پہلے درویش کو دیکھا اور قدرے چوکنا ہو کر اپنی کہانی بیان کرنے لگا:

"یہ کہانی دراصل مری نہیں۔ مرے ایک دوست کی ہے۔ میں اسے اسی کی زبان میں بیان کروں گا"

چوتھے درویش نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"مرا بھائی گہری نیند سویا ہوا تھا میں اس کے کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ مرے بھائی کی ناک سے شہد کی ایک مکھی نکلی...... قریب ہی پانی کا ایک ٹب پڑا تھا۔ جس میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تیر رہا تھا جو شاید کسی بچے نے ڈال دیا تھا...... شہد کی مکھی اڑ کر لکڑی کے اس ٹکڑے پر جا بیٹھی۔ کچھ دیر بعد پھر اڑی اور مرے بھائی کی ناک میں داخل ہو گئی...... میں یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا"۔

"اچھا۔ پھر کیا ہوا؟" پہلے درویش کی مسکراہٹ بڑی سفاک تھی، وہ اب بھی گلاب کے اس پودے کو دیکھ رہا تھا جو مسلسل پھلتا پھولتا جا رہا تھا۔

"پھر۔۔ پھر۔۔" چوتھا درویش خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا:

'پھر میرا بھائی بیدار ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک حیرت انگیز خواب سنایا...... اس نے بتایا کہ وہ کسی دریا کے کنارے کھڑا تھا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ تیرتا ہوا اس کے قدموں میں آ گیا، وہ اس پر سوار ہو گیا۔ جب وہ تختہ اسے دوسرے کنارے پر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جگہ خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر وہ اکیلا یہ خزانے نہ اٹھا سکتا تھا، اس لئے دوسرے ساتھیوں کو لینے کے لئے واپس آ گیا۔"

"حیرت ہے...... حیرت ہے!" پہلا درویش بڑے مکارانہ انداز میں بولا۔ اس کی نظریں اب بھی گلاب کے اس پودے پر گڑی تھیں جو اب بڑی شان سے لہلہا رہا تھا، چوتھا

درویش گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا:

''میں بھائی کا خواب سمجھ گیا۔ میں نے اسے قتل کر دیا اور وہ جگہ جہاں ٹب پڑا تھا اور شہد کی مکھی لکڑی کے ٹکڑے پر تیرتی رہی تھی، اسے کھود ڈالا...... وہاں واقعی خزانے تھے...... مگر...... مگر......''

''مگر کیا؟'' پہلے درویش کے لہجے میں تشویش کی ہلکی سی پرچھائیں ابھری۔

چوتھے درویش کی نظریں اس لہلہاتے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑیں۔

اور پھر وہی کیفیت......

''پانی......!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگادیا۔ مگر چوتھے درویش نے کوزہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

پانی پیا۔

پھر گلاب کے پودے میں ایک اور سرخ پتے کو ابھرتے ہوئے دیکھا۔

خوف سے جھرجھری لی۔

''مگر کیا......؟'' پہلے درویش نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''مگر...... یہ کہانی مرے دوست کی نہیں...... مری اپنی ہے...... اپنی......'' اور پھر چوتھے درویش نے بھی دم توڑ دیا۔

سارے صحرا نے خود کو سمیٹ کر پہلے درویش کے قدموں میں ڈال دیا۔

رات کا آخری پہر گزر چکا تھا۔

پو پھوٹ رہی تھی۔

پہلے درویش کے وحشیانہ قہقہے صحرا میں گونجنے لگے۔

''ہاہاہا...... اب اس صحرائی علاقے کی تیل کی دولت کا میں تنہا مالک ہوں۔ ایٹمی جنگ میں جتنے لوگ بھی بچ گئے ہوں گے سب مری رعایا ہیں...... اور میں اس نئے عہد کا

حکمران...... عظیم حکمران...... ہاہاہا......"

اچانک اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ اس نے کوزے کو دیکھا۔ کوزہ خالی ہو چکا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔

اور پھر پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔

وہ دوڑتا رہا...... دوڑتا رہا......

اور سمٹا ہوا صحرا پھیلتا رہا...... پھیلتا رہا......

سورج نصف النہار تک پہنچ گیا۔

اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

اس کے سامنے تیل کے چشموں کا ذخیرہ تھا، کنوؤں کی بجائے چشمے!

مگر پانی؟

پیاس کی شدّت،

شدید تھکاوٹ،

اور مسلسل پھیلتا ہوا صحرا،

وہ تیل کے چشمے پر ہی پیاس بجھانے کے لئے جھک گیا،

☯

اس کا آدھا جسم باہر پڑا تھا۔ سر پانی کے چشمے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھیلی ہوئی بانہیں آدھی سے زیادہ چشمے میں اور باقی باہر...... اور لمبے لمبے بال پانی میں لہراتے ہوئے تیر رہے تھے۔

اس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی تھیں۔

گلاب کے پودے پر ایک بڑا سا پھول اگ آیا تھا۔

گلاب کے اس پھول کا رنگ غیر معمولی حد تک گہرا سیاہ تھا۔

گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔ مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا نہ سننے والا۔

غریب بادشاہ

جو تجھ کو ملنے سے پہلے بچھڑ گیا حیدرؔ
تو کس طرح اسے پانے کی آس رکھتا ہے

"تساں بادشاہ ہو اساں کوں غریبی"

چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک دھوتی میں ملبوس، سجدہ ریز اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے، پسینے سے شرابور اس مجہول سے فقیر نے جس انداز میں یہ مصرعہ گاتے ہوئے پڑھا ہے اس کا ایک ایک لفظ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ میری روح میں اتر گیا ہے۔ میں رک گیا ہوں اور حیرت سے اس مجہول فقیر کو دیکھ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور ایک سرخ نوٹ اس کے جوڑے ہوئے ہاتھوں میں پھنسا دیتا ہوں...... ماہ رخ نے میری اس سخاوت کو حیرت سے دیکھا ہے لیکن بولی کچھ نہیں۔ اس کے قرب سے مجھے لگتا ہے میں سچ مچ کا بادشاہ ہوں۔

☯

''میں جب بھی اس شہر میں آتا ہوں یہاں کی کوئی نہ کوئی شے مجھے متاثر کر لیتی ہے ہلا کر رکھ دیتی ہے''

''مثلاً؟''

''مثلاً...... پہلی بار جب میں آیا تو اپنی فرم کی طرف سے کمرشیل وزٹ پر آیا تھا مگر یہاں تم سے نہ صرف ملاقات ہو گئی بلکہ پہلی ملاقات میں ہی اتنی فرینک نیس ہو گئی جیسے ہم ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی ہوں۔''

''ہوں!......اور اس بار؟''

''اس بار......اس مجہول فقیر کے گنگناتے ہوئے بول نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے''

''کیا واقعی تم اس سے متاثر ہو گئے ہو؟''

''یقین کرو نہایت عجیب اور انوکھا سرور محسوس کر رہا ہوں۔''

''شاید تمہیں فوک سانگس سے دلچسپی ہے!''

''ہاں شاید یہی وجہ ہو یا شاید......''

''میں تمہارے لئے اس طرح کے گیتوں کی ایک کیسٹ تیار کروالوں گی لیکن تمہاری اتنی گہری دلچسپی کا آخر کوئی جواز بھی تو ہو گا؟''

میں ماہ رخ کی طرف دیکھتا ہوں وہ پورے انہماک سے میرے جواب کی منتظر ہے۔

''فوک سانگس سے میری دلچسپی کا پس منظر بڑا عجیب سا ہے۔

ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں بھٹ واہن گیا۔ وہاں مجھے پتہ چلا کہ سسّی کی جنم بھومی بھٹ واہن تھی۔ وہاں کے راجہ کی بیٹی، سسّی جسے راجہ نے نجومیوں کے مشورے کے بعد صندوق میں بند کر کے دریا کے دھاروں کے سپرد کر دیا تھا اور یوں وہ بھٹ واہن سے بھنبھور پہنچ گئی۔''

میں سسّی کی طرف دیکھتا ہوں وہ پورے انہماک سے اپنی داستان سن رہی ہے:

''وہاں تمہاری پیدائش محل کے جس حصے میں ہوئی تھی اس کے کھنڈر ابھی تک

موجود ہیں۔ میں اس جگہ گیا تو میرا دل بھر آیا۔ روشنی کی ایک لکیر میرے اندر سے پھوٹی اور مجھ پر منکشف ہوا کہ میں ہی پنوں تھا۔ جو تمہیں تلاش کرتے ہوئے اس کھنڈر تک پہنچ گیا ہوں لیکن روشنی کی لکیر جو میرے اندر سے پھوٹی تھی وہ ایک دائرہ بن کر مجھے منور کرنے لگی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ہی پنوں تھا اور میں ہی مجنوں تھا، میں ہی فرہاد تھا اور میں ہی رانجھا تھا، میں ہی کرشن تھا اور میں ہی مہندرا تھا...... میں ہر روپ میں تمہیں ڈھونڈتا تھا اور تمہارے جتنے بھی نام تھے سسّی، لیلیٰ، شیریں، ہیر، رادھا۔ مومل، سب ایک تھے اور میرے بھی جتنے نام ہیں سب ایک ہیں...... لیکن ہم صدیوں سے ایک دوسرے کی تلاش اور جستجو میں حصے بخرے ہوتے چلے جارہے ہیں اور ہمارے ہر حصے میں دکھ کی ایک کہانی بنتی چلی جارہی ہے۔"

"بھئی! یہ کیا حماقت ہے؟...... ہم لوگ کتنی دیر سے تمہاراانتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

ماہ رخ کی چہکار نے مجھے جاگتی نیند سے بیدار کر دیا ہے۔ میں بے جان مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر ڈائننگ روم کی طرف چلنے لگتا ہوں۔

کھانے کے دوران ماہ رخ کے پاپا نے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کا مسئلہ چھیڑا تو ماہ رخ نے کہا:

"اس کے لئے مزدور کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ جب تک اسے شرکت کا احساس نہ دلایا جائے گا تب تک کارخانوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ نہیں ہو سکتا"

"نوجوانی میں پڑھے لکھے ذہنوں کو سوشلزم کا طلسم متاثر ضرور کرتا ہے، پختگی آنے سے پہلے نوجوان ایسی ہی جوشیلی باتیں کرتے ہیں...... اس بحث سے ہٹ کر دیکھیں تو آج کے مزدوروں کی فطرت کا یہ عالم ہے کہ ان کی دائیں مٹھی میں نوٹ دے دیں تو بایاں ہاتھ آگے کر دیں گے، بائیں ہاتھ کو بھر دیں تو پھر دایاں ہاتھ آگے کر دیں گے۔ جہاں نوٹ ملنے میں اسٹاپ آیا وہیں حق تلفی کے نعرے گونجنے لگیں گے۔"

ماہ رخ کے پاپا کے لفظوں سے ایک منجھے ہوئے کارخانہ دار کی شخصیت اپنی جھلک

دکھارہی تھی۔

"میرا خیال ہے مل مالکان اور مزدوروں میں فاصلہ ملز انتظامیہ کی بداندیشی سے پیدا ہوتا ہے۔ انتظامیہ کے افسران کی غلط پالیسیاں بھی نفاق کا باعث بنتی ہیں مثلاً میرے ادارہ کے میرے ایک کولیگ جو ایک دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں ان کی پالیسی یہ ہے کہ مہینے میں ایک دوبار ہر مزدور کو کسی سبب سے یا بلا سبب جھاڑ ضرور پڑنی چاہیئے اس طرح یہ لوگ اپنی اوقات میں رہتے ہیں"

"کتنی گھٹیا ذہنیت ہے ایسے لوگوں کی" ماہ رخ اس وقت کسی کارخانہ دار کی بیٹی کی بجائے کسی مزدور یونین کی لیڈر لگ رہی تھی...... "برصغیر کی تاریخ میں......"

لیکن اس سے پہلے کہ مزدوروں اور کارخانہ دار کا مسئلہ کوئی سنگین صورت اختیار کرتا ماہ رخ کے پاپا ہنستے ہوئے معذرت کر کے اٹھ گئے اور برصغیر کی تاریخ کے تذکرے سے بات کا رخ ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی طرف مڑ گیا، "قدیم کلچر آج بھی کسی نہ کسی روپ میں ہمارے ساتھ ہے۔ جذباتی نعرے بازی کر کے اس سے فرار حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہماری پیدائش سے لے کر شادی، بیاہ اور مرگ تک کی رسومات پر قدیم ہندوستانی کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ کھرچنے سے بھی ختم نہ ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اب ہماری اپنی تہذیب کا رنگ جمتا جارہا ہے، اور ہماری اپنی تہذیب اس سے زیادہ خوبصورت ہے"

"یہ تہذیب بھی اس کلچر کے اثرات سے خالی نہیں۔ کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آجاتا ہے۔"

"بابا! اس میں کلچر کا کیا کمال ہے۔ یہ تو دھرتی کا کمال ہے۔ جغرافیے کا کمال ہے۔ یہاں کی مٹی۔ یہاں کے دریا، پہاڑ، کھیت، جنگل، آب و ہوا، انہیں سے ہی تمہارے قدیم کلچر کی تشکیل ہوئی تھی اور انہیں عناصر ہی سے ہماری تہذیب بن رہی ہے اس میں جغرافیے کے ساتھ ساتھ ہماری ہسٹری بھی شامل ہو گئی ہے" اور پھر بحث اس اتفاق پر ختم ہوئی کہ قدیم

ہندوستانی کلچر کے ایک مخصوص موضوع "رسم شادی" پر ایک تازہ ویڈیو فلم دیکھی جائے۔

☯

گھنے جنگل کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان،

گہری تاریک رات،

میدان کے ایک سرے پر ایک چبوترے پر قبیلے کا سردار اپنی قبائلی آن بان کے ساتھ براجمان ہے اس کے پیچھے، دائیں بائیں جری کمان دار چوکس کھڑے ہیں۔ میدان کے وسط میں آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن ہے۔ سردار کے دائیں بائیں دونوں اطراف سے لے کر میدان کے دوسرے سرے تک الاؤ کے گرد لوگوں کا ایک دائرہ سا بن گیا ہے، لوگوں نے اپنے سیاہ چہروں پر چکناہٹ مل کر خود کو چمکایا ہوا ہے، ڈھولک کی تھاپ گونجتی ہے اور پھر گونجتی ہی چلی جاتی ہے۔ پھر اس تھاپ کے ساتھ ایک عجیب سا ساز اُبھرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں اس ساز سے واقف ہوں لیکن کچھ یاد نہیں پڑتا۔ عجیب سا ساز ہے، ایک لمحے روح کی پاتال تک اتر جاتا ہے اور دوسرے لمحے میں خوفزدہ کر دیتا ہے۔ مسرت اور خوف کی عجیب سی کشمکش...... اچانک قبیلے کے سردار کی پاٹ دار آواز گونجتی ہے اور ڈھولک اور ساز کی آواز قدرے مدھم ہو جاتی ہے۔ سردار نے پتہ نہیں کیا کہا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی شرمائی شرمائی سی، اپنے ہاتھ میں موتیوں کی مالا لئے آگے بڑھنے لگتی ہے۔

قبیلے کے سردار نے پھر کچھ کہا ہے اور اب دو نوجوان لڑکے ایک ساتھ آگے بڑھ آئے ہیں۔ ڈھولک کی تھاپ اور اس مانوس سے ساز کی آواز ایک دم تیز ہو جاتی ہے۔ جلتے ہوئے الاؤ کی سرخ زبانیں کچھ اور لمبی ہو گئی ہیں۔ وہ نوجوان لڑکی دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی ان نوجوانوں کی طرف بڑھ رہی ہے...... اب وہ دونوں کے روبرو کھڑی ہے۔ دونوں نوجوانوں کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے سانس نیچے رک گئے ہیں...... ڈھولک کی تھاپ اور اس ساز کی آواز کچھ اور تیز ہو جاتی ہے۔ اور پھر...... لڑکی نے ایک نوجوان کے گلے میں

ہار ڈال دیا،

مجھے پتہ نہیں کیا ہوا، میں نے تیزی سے اٹھ کر وی سی آر کا سوئچ آف کر دیا۔

"یہ کیا؟" ماہ رخ نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"بس۔ اب آگے اس ہار جانے والے نوجوان کا حال نہیں دیکھا جائے گا۔ بے چارہ!"

"اس میں بے چارگی کی کیا بات ہے۔ قدیم ترین زمانوں میں تو لڑکی کے سارے امیدوار لڑتے تھے، ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ جو آخر میں فتح یاب ہوتا تھا وہ شادی کا حق دار بنتا تھا۔ یہ تو اس زمانے کے بعد کی فلم ہے"

☯

ماہ رخ کے پاپا کی فیکٹری سے متعلق ہمارے ادارے کا کام آج مکمل ہو گیا ہے اور آج ہی میرا واپسی کا ارادہ ہے تاہم میں نے طے کیا ہے کہ جانے سے پہلے ماہ رخ سے شادی کے مسئلہ پر بات کر ہی لوں۔ ہماری دوستی جتنی تیزی سے بڑھی ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہمیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہئے۔ یوں بھی آج صبح سے ہی ماہ رخ خاصے خوشگوار موڈ میں ہے۔ اس پیش کش سے اس کا خوشگوار موڈ رومینٹک بھی ہو جائے گا۔

"کیا تمہیں پتہ ہے میں اپنے مذہبی تہوار منانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مذہبی تہوار بھی اسی عقیدت اور احترام کے ساتھ مناتی ہوں۔ کرسمس، بیساکھی، دیوالی......"

"یہ بڑی اچھی بات ہے اگر ساری قومیں اسی طرح ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے لگیں تو دنیا میں مذہب کے نام پر کبھی کوئی فتنہ فساد پیدا نہ ہو"

"آج کا دن میرے لئے دوہری خوشی لایا ہے۔ ایک تو یہ کہ آج بھی ایک تہوار ہے اور دوسری یہ کہ آج ہم ایک مقدس رشتے میں منسلک ہونے کا اقرار کریں گے"

(مقدس رشتے کی بات سن کر میرا دل مارے خوشی کے دھڑکنا بھول گیا ہے،
واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں نے آج خود ماہ رخ سے رشتے کی بات چھیڑنی تھی مگر
میرے بات کرنے سے پہلے وہ خود یہی بات طے کر چکی ہے)

''میں نے کئی نوجوان دیکھے ہیں مگر کوئی بھی میرے معیار پر پورا نہیں اُترا۔ تم پہلے
نوجوان ہو جس کی آنکھوں کی سچائی کو میرے دل نے تسلیم کیا ہے اور جو صحیح معنوں میں
میرے کڑے معیار پر پورا اُترا ہے''

(میرے انگ انگ میں مسرّت بھر گئی ہے)

''میں نے ابھی ڈیڈی سے بات کی تھی وہ بھی میرے انتخاب پر بے حد خوش ہیں''

(مسرّت میرے انگ انگ میں لبالب بھرنے کے بعد اب ندی کے دھاروں کی
طرح چھلکنے لگ گئی ہے)

''لاؤ اپنا ہاتھ ادھر لاؤ''

میں نے آنکھیں موند کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا ہے۔ بے خودی اور سر
شاری کی کیفیتیں مجھے شرابور کر رہی ہیں۔

''آج کے دن بہنیں اپنے بھائیوں کو راکھی باندھتی ہیں۔ میرا کوئی بھائی نہیں جسے
میں راکھی باندھتی لیکن آج میری زندگی کا یہ ادھورا پن ختم ہو رہا ہے''

میرے دل، دماغ اور سماعت پر سینکڑوں ایٹم بم گر گئے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو
آنکھوں پر بھی ہزاروں ایٹم بم گر گئے ہیں۔ اس نے مجھے راکھی کے بندھن میں باندھ لیا ہے،

میرے اندر ایک گھنا جنگل اُگ آیا ہے اور جنگل کے درمیان ایک وسیع میدان
میں (میرے سینے کے عین وسط میں) آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن ہے۔ سارا قبیلہ جمع
ہے۔ ڈھولک کی تھاپ تیز ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس ساز کی آواز بھی تیز ہو جاتی ہے
جو ایک لمحے میں روح کی پاتال تک اُتر جاتا ہے اور دوسرے لمحے میں خوفزدہ کر دیتا ہے، میں
اس ساز کو اب پوری طرح جان گیا ہوں سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ لڑکی نے موتیوں کا ہار

دوسرے نوجوان کے گلے میں ڈال دیا ہے، میں اپنی شکست کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا مگر اب وی سی آر کا سوئچ تو نہیں جسے آف کر کے فرار ممکن ہو سکتا ہے۔ میرے اندر اور باہر میری شکست کے منظر ہیں۔

ماہ رخ نے سچ کہا تھا "کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آجاتا ہے"

☯

چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک دھوتی میں ملبوس، سجدہ ریز اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے، پسینے سے شرابور وہ مجہول فقیر اب بھی وہی مصرعہ گاتا چلا جا رہا ہے:

"تساں بادشاہ ہو اساں کوں غریبی"

میں نے پرس میں صرف واپسی کے کرائے کے پیسے رکھے ہیں اور جیبوں تک سے نکال کر سارے چھوٹے بڑے نوٹ اس فقیر کو دے دیئے ہیں۔

ماہ رخ نے تعجب سے مجھے دیکھ کر پوچھا ہے "یہ کیا؟"

"صرف واپسی کا کرایا"

"تساں بادشاہ ہو اساں کوں غریبی"

اس عارفانہ کلام کی ایک نئی معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے، ماہ رخ کے قرب سے میں اب بھی خود کو بادشاہ محسوس کرتا ہوں مگر غریب بادشاہ!

ڈھند کا سفر

کسی کا جھوٹ جب اس عہد کی سچائی کہلایا
ہمارا سچ تو خود ہی موردِ الزام ہونا تھا

"گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے۔

بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا۔"

میں ٹرین کے ڈبے میں لکھی یہ تحریر حیرت سے پڑھتا ہوں اور اس کے اوپر لٹکی ہوئی زنجیر کو دیکھتا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ زنجیر کھینچنے سے یہ گاڑی کیسے رک سکتی ہے

آپی اپنی سیٹ پر بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی ہے۔

بلو ساتھ والی مسافر خواتین کو مختلف چیزیں کھاتا دیکھ کر امی کو مخاطب کرتی ہے اور پھر ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔

"امی...... ہیں ہیں ہیں"

امی اسے گھورتی ہیں مگر ڈھائی سال کی بچی کو کیا پتہ کہ ماں کیوں گھور رہی ہے۔ امی

نے اپنے ساتھ موجود بڑے سے تھیلے سے کھانے کی کچھ چیزیں نکال کر بلو اور آپی کو دی ہیں۔ آپی میرے حصے کی چیز لا کر مجھے دینے لگتی ہے،

دو سال پہلے کی بات ہے جب ہم چار سال اور تین سال کے تھے۔ تایا جی ہمارے ہاں آئے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے کہیں باہر چلے گئے تو آپی نے اور میں نے مشترکہ طور پر سوچا کہ ہمارے تایا جی گم ہو گئے ہیں اور پھر صلاح کی کہ ہم دونوں چل کر انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ ہم بڑی خاموشی سے گھر سے نکل آئے۔ قریبی بازار تک آئے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ راستے گم ہونے لگے اور تایا جی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم خود گھر کا راستہ بھول گئے، نہ تایا جی ملے نہ گھر کا راستہ۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ہم دونوں نے رونا شروع کر دیا۔ کسی شریف دوکاندار نے ہمیں اپنی دوکان پر بٹھالیا اور ڈھیر ساری مٹھائی بھی ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہم نے مٹھائی کھانے کے ساتھ ساتھ رونے کا عمل بھی جاری رکھا تاوقتیکہ تایا جی اور ابا جی ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں تک نہ آگئے۔ تب ہم مارے خوشی کے باقی مٹھائی اٹھانا بھی بھول گئے۔

''بھائی! یہ لونا اپنی چیز۔'' آپی کی آواز میں جھنجھلاہٹ ہے اور میں چونک اٹھتا ہوں۔

''جی۔ہاں۔ آں۔'' میں اپنے حصے کی چیز لیتا ہوں اور پھر اسے وہ زنجیر اور اس کے نیچے لکھی تحریر دکھاتا ہوں وہ بھی حیران ہوتی ہے مگر اس طرح ڈر کر امی کے پاس بھاگ جاتی ہے، جیسے اس کے دیکھنے سے ہی زنجیر کھنچ جائے گی اور گاڑی رک جائے گی...... بلو اپنے حصے کی چیز کھا کر پھر ان خواتین کی طرف دیکھتی ہے جو مسلسل کچھ نہ کچھ کھائے جا رہی ہیں اور پھر ''امی...... ہیں ہیں ہیں'' کی گردان شروع کر دیتی ہے۔ امی پھر تھیلے میں ہاتھ ڈالتی ہیں۔

میں ان خواتین کی طرف دیکھتا ہوں۔ ان میں سے ایک بے حد خوبصورت عورت مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی نگاہوں سے سورج کی کرنیں میری جسم پر اترنے لگتی ہیں اور میں جیسے ایک دم جوان ہونے لگتا ہوں۔ پانچ سے

دس، دس سے پندرہ، پندرہ سے بیس اور بیس سے پچیس۔ اب میں پچیس سال کا بھرپور جوان ہو گیا ہوں۔ مگر گاڑی کا سارا منظر بدل چکا ہے۔ زنانہ ڈبہ کی بجائے مردانہ ڈبہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس سیٹ بھی نہیں ہے۔ فرش پر اکڑوں ہو کر بیٹھا ہوں اور سارے فرش پر بھی اتنا رش ہے کہ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنا مشکل ہے۔

ایک اسٹیشن پر مسافروں کا ایک بڑا تیز ریلا اندر آتا ہے۔ چھوٹے سے اسٹیشن پر اتنے مسافر!...... شاید کوئی بارات ہو۔ اگاڑی چلتی ہے تو مسافروں کے اوسان بحال ہونے لگتے ہیں۔ ایک مسافر نے ٹرین کے چیکر کو ایک ایسی گالی دی ہے کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں۔ دو چار اور مسافروں نے بھی ایسی ہی گالیاں دیں تو پتہ چلا سارے بے چارے فرسٹ کلاس کے فرش پر بیٹھے تھے۔ سب سے دس دس روپے جرمانہ وصول کر کے بغیر رسید کے سب کو اس ڈبے میں دھکیل دیا گیا ہے۔

گالیوں کا سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔

گالیاں ریلوے کے مختلف افسران سے ہوتی ہوئی ریلوے کے چیئرمین تک پہنچ چکی ہیں۔

پھر وزیر ریلوے بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ جتنے منہہ اتنی باتیں۔ بالکل میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک "یک چشم" داڑھی والے نے دانت پیستے ہوئے بابائے قوم کو بھی گالی دے دی ہے۔

میں سناٹے میں آگیا ہوں۔

اس کی بدزبانی پر کوئی احتجاجی آواز بھی نہیں ابھری۔

مجھے لگتا ہے ہم سب زمین میں دھنستے جا رہے ہیں۔

گردن تک ہم زمین میں دھنس گئے ہیں۔

میرے اندر کا وہ پانچ سالہ بچہ نکل کر زنجیر کے پاس جا کھڑا ہوا ہے اور میرے اشارے کا منتظر ہے۔ میں اس یک چشم داڑھی والے کو سخت لعن طعن کرتا ہوں۔

"بابائے قوم کا کیا قصور؟ یہی کہ اس نے تمہیں آزادی دلائی ہے...... میں لمبی چوڑی تقریر کرتا ہوں۔ مگر وہ یک چشم داڑھی والا بڑی متانت سے پھر وہی گالی بابائے قوم کا نام لے کر دہراتا ہے۔

آخر میں اپنے اندر کے اس پانچ سالہ بچے کو اشارہ کرتا ہوں کہ وہ زنجیر کھینچ دے۔ مگر اس دوران ہی ایک بے حد خوبصورت خاتون سے اس کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور وہ جوان ہونے لگتا ہے۔ پہلے وہ زنجیر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اب اس خوبصورت خاتون کو حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ میں خود آگے بڑھ کر زنجیر کھینچ دیتا ہوں۔

"اس خبیث کو ابھی گرفتار کراتا ہوں۔ ذلیل انسان بابائے قوم کے دیس میں بابائے قوم کو گالیاں دیتا ہے۔" گاڑی رک گئی ہے۔ ریلوے گارڈ، ٹکٹ چیکر اور کچھ پولیس والے آچکے ہیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ اس ذلیل شخص نے بابائے قوم کی شان میں گستاخی کی ہے۔ مگر شاید ریلوے کے عملہ کو میری بات سمجھ نہیں آتی۔ گارڈ اور چیکر میری بات سے جھلا گئے ہیں۔

اور پھر چیکر میرے جرمانے کی رسید کاٹنے لگتا ہے۔

پچاس روپے جرمانہ ادا کرتے ہوئے میرے ہونٹوں پر وہی گالی مچلتی ہے جو اس سے پہلے وہ یک چشم داڑھی والا بابائے قوم کے خلاف بکتا رہا تھا۔ مگر میں گالی کو ہونٹوں پر اترنے سے پہلے ہی روک لیتا ہوں۔ پتہ نہیں بابائے قوم کے احترام کے باعث یا ان پولیس والوں کے باعث جو ریلوے گارڈ اور ٹکٹ چیکر کے ساتھ کھڑے ہیں۔

اتنا ضرور ہے کہ میں ایک دم چھوٹا ہوتا جارہا ہوں اور گھٹتے گھٹتے ایک نقطے میں ڈھل گیا ہوں۔ زنجیر کے نیچے کھڑا پانچ سالہ "میں" پھر حیرت سے اس تحریر کو پڑھ رہا ہوں۔

"گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے
بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا"

بلوا اپنے حصے کی چیز کھا کر پھر "امی...... ہیں ہیں ہیں" کی گردان کر رہی ہے۔

آپی میرے حصے کی چیز لے کر پھر مجھے دے رہی ہے۔

مگر میں اب دانستہ آپی کی بات نہیں سن رہا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے اس کے بعد ہی میری نظر اس خوبصورت خاتون کی طرف اٹھ جائے گی جو بڑی دیر سے مجھے دیکھ رہی ہے اور پھر ...... اور پھر ...... میں خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور بند آنکھوں سے ہی پڑھنے لگتا ہوں:

"گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے

بلا وجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہو گا۔"

آپ بیتی

اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدرؔ
اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں

اس دن ماں نے مجھے معمول کے مطابق فجر کے وقت جگایا تھا مگر اس کا لہجہ معمول کے مطابق نہ تھا۔ میں نے تاروں کی روشنی میں ماں کی آنکھوں میں تشویش جھلکتی دیکھی۔ ماں مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں گہری سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا آسمان پر شفق پھوٹنے کی بجائے خون پھوٹ بہا ہے۔

اس دن سارا شہر خوفزدہ تھا لوگوں کی نظریں اخبارات کی خبروں پر جم کر رہ گئیں۔

ٹریفک کے حادثے میں بیس افراد ہلاک اور تیس شدید زخمی۔

ملزمان پندرہ روز تک مجھے مسلسل بے آبرو کرتے رہے۔ برآمد کی جانے والی مغویہ کا بیان۔

ایک نوجوان نے محبت میں ناکام ہو کر محبوبہ کو ہلاک کر دیا۔

سگے باپ، بھائی اور بھابھی کو قتل کر دیا، خانگی جھگڑے کا شاخسانہ۔

ساری خبریں معمول کے مطابق تھیں مگر اس دن یہ ساری خبریں غیر معمولی لگ رہی تھیں۔ لگتا تھا ہر خبر کا آسمان کی سرخی سے کوئی تعلق بنتا ہے۔

اس دن شہر میں بہت سی بھڑیں آ گئی تھیں۔ پہلے شہر میں جس طرح مکھیاں بھنبھناتی تھیں اب ویسے ہی بھڑیں اڑتی پھرتی تھیں۔

اس دن شدید گرمی کے باعث میں نے قمیص اتار رکھی تھی اور بنیان پہنے اپنی کرسی پر بیٹھا اس دن کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ ڈاک میں دیگر خطوط کے ساتھ میری ایک بہت ہی اچھی دوست کا خط بھی تھا۔ جونہی میں اس کا خط پڑھنے لگا مجھے اپنے سینے پر شدید جلن محسوس ہوئی۔ ایک بھڑ نے میرے سینے پر ڈنک مارا تھا۔ میں تکلیف کے عالم میں ماں کے پاس آیا تو اس نے لوہے کی کسی چیز کو ڈنگ والی جگہ پر رگڑتے ہوئے دم کیا اور میری تکلیف بڑی حد تک دور ہو گئی پتہ نہیں اس دم کی وجہ سے یا ماں کی وجہ سے یا شاید دونوں کی وجہ سے!

اس دن شام کو غروب آفتاب کے بعد آسمان کی طرف پھر ویسی ہی گہری سرخی چھا گئی اور دن بھر کے پریشان لوگ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے یہ سارے واقعات صرف اس دن ہی غیر معمولی لگے۔

طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب کے بعد اب بھی آسمان گہرا سرخ ہوتا ہے۔ بھڑیں اب بھی شہر میں دندناتی پھرتی ہیں۔ قتل، اغوا، ایکسیڈنٹ اور آبروریزی کے واقعات اب بھی ہوتے ہیں مگر لوگ اب پہلے کی طرح پریشان نہیں ہوتے۔ انہوں نے آسمان کی سرخی کو بھی معمولات زندگی میں شمار کر لیا ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میری ماں کی آنکھوں میں ابھی تک تشویش جھلک رہی ہے۔ وہ اپنی تشویش سے آگاہ کر کے مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتی لیکن میں نے راتوں کو دیکھا ہے کہ وہ کئی دفعہ اٹھ اٹھ کر آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر مجھے سوتا جان کر مجھ پر دم کرتی رہتی ہے۔ ایک دو دفعہ میں نے سنا وہ میرے باپ سے آہستہ آواز میں اپنی تشویش کا اظہار کر رہی تھی اور میرے باپ

نے آسمان کی سرخی کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر کرتے ہوئے کہا تھا کہ دنیا پر عنقریب بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔ اپنی ماں اور باپ کی اس تشویش کو دیکھ کر مجھے بھی کبھی کبھی تشویش ہونے لگتی ہے۔

جب پہلے پہل لوگوں نے خوف کا اظہار کیا تھا تب وہ بھی اس آسمانی تبدیلی کو اجتماعی زاویے سے دیکھ رہے تھے اور میرے ماں باپ بھی اسے کسی اجتماعی تباہی کا پیش خیمہ سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ماں راتوں کو اٹھ اٹھ کر مجھے کیوں دم کرتی رہتی ہے؟ اس سوال نے مجھے اس سارے معاملے کو انفرادی زاویے سے دیکھنے کی تحریک کی ہے اور میں آسمان کی سرخی کو اپنی ذات کے حوالے سے سوچنے لگتا ہوں۔

(۲)

"رات دو بجے...... عقبی دروازہ...... ٹھیک!"

میں اس بے ربط مگر معنی خیز تحریر کو پڑھتا ہوں اور اس خوبصورت لڑکی کا سراپا مجھے اپنے پورے وجود میں خوشبو بکھیرتا محسوس ہوتا ہے جو ایک عرصے سے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ میری ایک بہت ہی اچھی دوست نے مجھے کئی دفعہ اس خوبصورت لڑکی سے لاتعلقی کی نصیحت کی تھی۔ مگر میں نے ہمیشہ اس کی نصیحت کو نظرانداز کیا۔ اور آج جب اس خوبصورت لڑکی نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا ہے تو میرے ذہن میں خود بخود گناہ کا تصور ابھرنے لگتا ہے۔ ماں سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میں بیٹھک میں آ کر بظاہر سو جاتا ہوں۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں اور میں نے لیٹے ہی لیٹے دائیں طرف کروٹ بدل کر خیال ہی خیال میں اس خوبصورت لڑکی کو اپنے پہلو میں سلا لیا ہے۔ میری سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ اور عین اس وقت جب میں کلائمکس پر پہنچنے لگا ہوں میں نے اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لینا چاہا ہے...... مگر مجھے جیسے یکدم کرنٹ لگ گیا ہے۔ میرے ہاتھوں میں جو چہرا ہے وہ ہو بہو میری بیٹی کا ہے۔ میری ننھی

بچی...... جیسے ایک دم جوان ہو کر میرے ساتھ لیٹی ہو۔ میں خوف زدہ ہو کر بیٹھک سے نکل کر باہر سڑک پر آجاتا ہوں۔ اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں۔

کافی دیر بعد میں دوبارہ اندر آتا ہوں۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ میں پھر بستر پر لیٹ جاتا ہوں مگر خوف کے باعث اب بائیں کروٹ لیتا ہوں۔ لیٹتے ہی وہ خوبصورت لڑکی پھر میرے پہلو میں آگئی ہے اور...... اور...... نہ چاہتے ہوئے بھی میں پھر اس کے جسم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے پورے وجود میں سمونے لگتا ہوں۔ اپنے سارے عمل کے دوران میں شعوری طور پر کوشش کرتا ہوں کہ اس کا چہرہ نہ دیکھوں۔ مگر...... اس نے اپنے ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام لیا ہے میں قدرے جھجکتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ یہ چہرہ میری بیوی کا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میری بیوی ایک ماہ سے میکے گئی ہوئی ہے۔ اس کی عدم موجودگی کے باوجود اس کی موجودگی میں کوئی ہرج نہیں۔ میں اس کے جسم کو اور بھینچ لیتا ہوں۔ لیکن مجھے پھر کرنٹ لگتا ہے...... میں نے اپنے آپ کو دیکھا تو میری جگہ کوئی اور تھا۔

میں پھر خوفزدہ ہو کر سڑک پر نکل آتا ہوں اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کی خونی سرخی دراصل میرے اس ہونے والے ریپ کی گواہ اور اس خوبصورت لڑکی کے بہنے والے خون کا ثبوت ہے۔ لیکن ہم دونوں میں اصل مجرم کون ہے؟

مری اس اچھی دوست نے ایک دفعہ جھلا کر مجھے کہا تھا "آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے مخلص نہیں ہیں صرف اپنے جذبات کی تسکین کے لئے ایک دوسرے سے فراڈ کر رہے ہیں"...... لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بڑے بڑے مخلص دوستوں کو بھی ذاتی مفاد کی خاطر انتہائی گھٹیا سطح پر اترتے دیکھا ہے۔ خود میری اس اچھی دوست نے میرے ساتھ زبردست فراڈ کیا ہے۔ ایسا فراڈ جو ابھی تک وہ خوبصورت لڑکی بھی میرے ساتھ نہیں کر سکی۔

عشق کے روایتی قصوں میں ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں مگر رات کو کسی سے چوری چھپے ملنے جانا میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ گہری سیاہ رات میں پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں لیکن جب میں اس کے دروازے پر ہلکی سی چاپ دینے لگتا ہوں تو اچانک روشنی میں نہا جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے سارا شہر میرے تعاقب میں نکل آیا ہے اور میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہوں۔ میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ میرے چاروں طرف گھور اندھیرا ہے، پھر میں کس روشنی میں نہا گیا ہوں؟ کہیں یہ مرے اندر کی روشنی تو نہیں؟...... مرے شجرے کی روشنی؟

دروازہ کھل گیا ہے اور میں اپنے سوالوں کے جواب سوچے بغیر اندر داخل ہو گیا ہوں۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی اور ایک کرسی پڑی ہے، لیکن ہم دونوں چارپائی پر ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔ اس نے اپنی کمر کا بوجھ مرے اس بازو پر ڈال رکھا ہے جو میں نے اس کی کمر میں حمائل کر رکھا ہے۔ گپ شپ کرتے ہوئے اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری بیوی اور میری بیٹی دونوں میرے دائیں بائیں آن کھڑی ہیں۔ وہ دونوں مجھے میرے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیتی ہیں، سامنے میری وہ اچھی دوست اپنا منہ دوسری طرف پھیرے کھڑی ہے۔ میں عین موقعہ پر پکڑے جانے کی شرمندگی کے ساتھ باہر آنے لگتا ہوں۔ وہ خوبصورت لڑکی مجھے حیرت سے دیکھتی ہے۔

واپس آکر میں ٹائم دیکھتا ہوں۔ تین بج رہے ہیں۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے گہری نیند آجاتی ہے...... ماں حسب معمول فجر کے وقت مجھے جگاتی ہے تو میں بمشکل آنکھیں کھول پاتا ہوں۔ ماں کے چہرے پر فکر مندی کے گہرے اثرات ہیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتاتی ہے کہ آج آسمان پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہے۔ میں کمرے سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر حیرت سے ماں کا چہرہ تکنے لگتا ہوں۔

"ماں! آج تو آسمان پر معمولی سرخی بھی نہیں ہے۔ بالکل صاف آسمان ہے"

ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر غالباً مجھ پر دم کرنے کے لئے

کوئی آیت پڑھنے لگتی ہے...... میں کمرے میں آکر بڑے آئینے کے سامنے اپنے بال درست کرنے لگتا ہوں، بال درست کرتے ہوئے مجھے اپنی آنکھیں لال انگاروں کی طرح نظر آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے آسمان کی ساری خونی سرخی مری آنکھوں میں آتر آئی ہے میں نے انفرادی زاویے سے آسمانی سرخی کا بھید پالیا ہے...... ماں کمرے میں آکر مجھ پر پھونکیں مارتی ہے، مجھے لگتا ہے وہ کہنا چاہتی ہے کہ مجھے تمہارے رات کے سارے عمل کا پتہ ہے لیکن پھر میرے شرمندہ ہونے کا خیال کر کے چپ چاپ لوٹ جاتی ہے۔ میں وضو کرنے کے لئے باہر آنے لگتا ہوں تو ایک کتاب پر ایک بھڑ کو بیٹھا دیکھتا ہوں...... ایک دوسری کتاب اٹھا کر میں نے اس بھڑ پر دے ماری ہے اور اسے اس کے ڈنک سمیت ختم کر دیا ہے...... اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی اس اچھی دوست کا خیال آجاتا ہے جس کی ایک زیادتی کے باعث میں اس سے ناراض ہوں۔

ممکن ہے وہ اپنی زیادتی پر نادم ہو اور اس ندامت کا احساس آسمان کی ساری سرخی اس کی آنکھوں میں بھر دے...... ممکن ہے آج شام کو غروب آفتاب کے بعد مری طرح اسے بھی آسمان خون آلود نظر نہ آئے اور وہ بھی میری طرح انفرادی زاویے سے آسمان کی سرخی کا بھید جان لے...... اور ممکن ہے وہ بھی کسی بھڑ کو اس کے ڈنک سمیت مار دے۔

میں اس خوبصورت لڑکی کے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہتا ہوں لیکن فی الحال میں طے کرتا ہوں کہ آج ناشتے کے بعد تازہ اخبار کا مطالعہ نہیں کروں گا۔ قتل، اغوا، زنا، ایکسیڈنٹ کی خبریں تو روز کا معمول ہیں۔ آج میں ناشتے کے بعد اپنی اس اچھی دوست کا خط پڑھوں گا جس سے میں ناراض ہوں۔

وہی خط جسے پڑھتے وقت بھڑ نے میرے سینے پر ڈنک مارا تھا۔

ایک کافر کہانی

صوفی، سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں
خود ہی اپنا رستہ، منزل اور سفر ہو جائیں

بڑی عجیب اذیت ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں رکوع تک تو نماز ٹھیک رہتی ہے لیکن سجدے میں کہیں اور پہنچ جاتا ہوں۔ اسٹین گن اٹھائے مکروہ نکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا ایک شخص میرے روبرو آجاتا ہے۔ میں سجدے میں خدا کو ڈھونڈتا ہوں۔ وہ کہتا ہے!"میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دوں گا"

میں سوچتا ہوں شاید خدا بھی اس کے سامنے بے بس ہو گیا ہے لیکن یہ کافرانہ خیال آتے ہی سجدے سے سر اٹھا لیتا ہوں۔

مجھے ابراہیم ادھم رحمت اللہ علیہ کا واقعہ یاد آتا ہے جب وہ ہر قدم پر سجدے کرتے ہوئے چودہ سال کی مسافت طے کر کے مکہ پہنچے تو کعبہ اپنے مقام پر موجود نہ تھا۔ تب غیب سے آواز آئی تھی۔

”کعبہ ایک ضعیفہ کے استقبال کے لئے گیا ہے جو ادھر آ رہی ہے۔“

آپ پکار اٹھے کہ وہ کون ہے!...... اتنے میں دیکھا کہ رابعہ بصری عصا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہیں۔ پھر کعبہ بھی اپنے اصلی مقام پر آ گیا۔*1

لیکن مجھے تو سجدے میں وہی مکروہ نکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا اسٹین گن اٹھائے نظر آتا ہے، تنگ آ کر میں جنگل کی طرف نکل جاتا ہوں اور اپنے اندر ہی اندر سفر کر کے ایک بزرگ سے ملتا ہوں اور انہیں اپنا روگ بتاتا ہوں۔ ان کے چہرے پر نورانی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے وہ کہتے ہیں:

”میں سو سال محراب میں رہا اور اپنے تئیں حیض والی عورت کی طرح جانتا تھا“*2

”تو کیا میں بھی حیض کی کیفیت میں ہوں؟“ میرے سوال کے جواب میں بزرگ کے چہرے پر اثباتی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اب میں ان سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ”سبحانی ما اعظم شانی“*3 کہا تو میں چونک اٹھتا ہوں۔ کہیں یہ بزرگ حضرت بایزید بسطامی تو نہیں؟ میں ان سے سوال کرتا ہوں۔

”عرش کیا ہے؟“

فرمایا ”میں ہوں۔“

”لوح و قلم کیا ہے؟“

فرمایا ”میں ہوں۔“

”ابراہیم، موسیٰ، محمد علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں؟“

فرمایا ”میں ہی ہوں“

”اللہ کے بندے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل علیہم السلام کے سے بھی ہیں؟“

فرمایا ”میں ہوں“

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

تب فرمایا:

''جو شخص حق میں محو ہو جاتا ہے اور جو کچھ ہے حق ہے اگر ایسی صورت میں وہ سب کچھ ہو تو کوئی تعجب نہیں۔'' 4*

مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بزرگ حضرت بایزید بسطامی ہیں۔ میں نے اُن کے ہاتھوں کو چوما اور کہا:

''قیامت کے دِن ساری خلقت محمدؐ کی جھنڈے تلے جمع ہو گی''

فرمایا: ''محمد علیہ الصلوۃ والسلام اِس سے زیادہ ہیں۔ خلقت میرے جھنڈے تلے کھڑی ہو گی۔'' 5*

میں فرط عقیدت سے انہیں لپٹ جاتا ہوں اور اپنی شفاعت کے لئے ان کی منّت کرتا ہوں لیکن تب ہی یکایک وہ بھی غائب ہو گئے اور میں بھی غائب ہو گیا۔ اب پتہ نہیں میری جگہ کون ہے کیوں کہ یہ بہر حال میں نہیں ہوں۔ اب میں جو بھی ہوں ابھی تک یہی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں۔

یکایک دیکھتا ہوں کہ:

''میں ماسوائے اللہ سے زائد ہو گیا پھر جب میں نے اپنے آپ کو بلایا تو حق تعالی سے آواز آئی میں نے خیال کیا کہ اب میں خلقت سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ میں لبیک اللہم لبیک کہتے ہوئے محرم ہو گیا پھر تسبیح کرنے لگا اور وحدانیت میں جب طواف کرنے لگا تو بیت المعمور نے میری زیارت کی، کعبہ نے میری تسبیح پڑھی، ملائکہ نے میری تعریف کی۔ پھر ایک نور نمودار ہوا جس میں حق تعالیٰ کا مقام تھا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو میری ملکیت میں کوئی بھی چیز نہ رہی۔'' 6*

اور پھر میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ:

''کبھی تو میں اِس کا ابو لحسن ہوں اور کبھی وہ ابوالحسن ہے۔ یعنی جب میں فنا ہوتا ہوں تو میں وہ ہوتا ہوں''۔ 7*

یکا یک ایک مرقع پوش ہوا سے اُترتا ہے اور زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہتا ہے:

"میں جنیدِ وقت ہوں

میں شبلیٔ وقت ہوں

میں بایزید وقت ہوں"

میں بھی اٹھ کر رقص کرنے لگتا ہوں

"میں خدائے وقت ہوں

مصطفائے وقت ہوں"*8

بہت سے لوگ میرے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ سب نجات کے طالب ہیں۔ میں انہیں کہتا ہوں" جاؤ فلاں قبرستان میں دفن ہو جاؤ تمہاری نجات ہو جائے گی۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" نجات کے ایک طالب نے پورے خلوص سے اپنے شک کا اظہار کیا ہے۔

"تمہیں خبر نہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ بعض قبرستان ایسے ہوں گے کہ ان کے چاروں کونے پکڑ کر انہیں بغیر حساب کے بہشت میں ڈال دیں گے۔ ان میں سے ایک بقیع بھی ہے"*9

میرا جواب سن کر شک کا اظہار کرنے والا کہتا ہے "یہ کافر ہے اسے سنگسار کردو۔"

ایک اور کہتا ہے "یہ بایزید بنتا ہے۔"

ایک اور بولتا ہے "ابوالحسن خراقانی بنتا ہے۔"

تب ان سارے نجات کے طالبوں نے اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے تاکہ مجھے سنگسار کر کے نجات پالیں۔ میں نے پتھروں کے ڈھیر میں دبے ہوئے دیکھا: "میں بایزید اور اویس قرنی ایک ہی کفن میں تھے"*10

پھر میں اپنے اندر سے باہر نکلتا ہوں اور اپنے آپ کو پہچانتا ہوں اور ان مقدس

ہستیوں کے فیوض اپنے آپ میں محسوس کرتا ہوں۔

لیکن جب نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں جاتا ہوں تو وہی مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا اسی طرح اسٹین گن لئے کھڑا ہے اور اسٹین گن کی طاقت کے نشے میں کہتا ہے۔ "میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دونگا۔"

میں اس کی احمقانہ بات پر دل ہی دل میں ہنستا ہوں خدا تو خود مجھ تک پہنچ گیا ہے۔

لیکن پھر یہ مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا ابھی تک اسٹین گن کیوں اٹھائے کھڑا ہے؟

یہ سوال میں نے پتہ نہیں کس سے کیا ہے؟

اپنے آپ سے یا خدا سے؟

مگر مجھے اپنے سوال کے حتمی اور عملی جواب کا انتظار ہے!

-----ماخذ-----

"تذکرۃ الاولیاء" تالیف حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ اُردو ترجمہ مطبوعہ منزل نقشبندیہ لاہور ۱۹۲۵ء۔

روشنی کی بشارت

بدل جاتے ہیں اک لمحے میں ہی تاریخ کے دھارے
کبھی جو موج میں آکر قلندر بول اٹھتے ہیں

"دیوانہ خاموش ہو گیا اور اپنے سامعین کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی خاموش تھے اور حیرانگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اس نے چراغ زمین پر پٹخ دیا جو ریزے ریزے ہو کر بجھ گیا۔

تب اس نے کہا:

میں بہت پہلے آگیا ہوں میرا تعلق مستقبل سے ہے۔ یہ مہیب واقعہ ابھی فاصلے ہی طے کر رہا ہے"

(نیطشے کی ایک تمثیل سے اقتباس)

اپنی آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ اپنے ہاتھوں پر اٹھائے جب میں شہر کے لوگوں کو روشنی کی بشارت دیتا ہوں تو وہ مجھے اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے

میں ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ کچھ لوگ میری بات پر ہنستے ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے آگے چلے جاتے ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر دیکھے بغیر کچھ سوچتے چلے جاتے ہیں۔

میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ میرے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن کوئی بھی میری بشارت پر ایمان نہیں لا رہا۔ مجھے شک گزرتا ہے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔ یہ لوگ مجھ سے سولہ سو برس پیچھے ہیں۔ یہ میری بات نہیں سمجھ پائیں گے۔ پھر کچھ سوچ کر میں اپنی ماں کے پاس جاتا ہوں اور روشنی کی بشارت دیتے ہوئے اسے بتاتا ہوں کہ میری آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ میری ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکوں سے دم کرنے لگتی ہے۔ میری چھوٹی بہن مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہے اور دبک کر ماں کے قریب ہو جاتی ہے۔ ماں کی سادگی اور بہن کے بھولپن پر افسردہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میں مبارکہ کے پاس آتا ہوں اور اسے بتاتا ہوں کہ میں دنیا کو روشنی کی بشارت دینے کے لئے مامور کیا گیا ہوں۔ میری آنکھوں میں سورج طلوع ہو رہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ مگر وہ میری بات پر توجہ کرنے کی بجائے مجھے دوکانداروں کے بلوں اور بچوں کی فیسوں کے بارے میں بتانے لگتی ہے۔ میں مایوس ہو کر عفت کے پاس چلا آتا ہوں۔۔ پہلے تو وہ میری بات پر توجہ نہیں کرتی لیکن جب میں پوری سنجیدگی سے اپنی بات دہراتے ہوئے اصرار کرتا ہوں کہ اب روشنی صرف میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں سے ہی اترے گی۔ تو وہ میرے قریب آ جاتی ہے۔۔ میرے ہاتھوں میں مٹی کے چراغ کو چھو کر دیکھتی ہے اور پھر پوچھتی ہے۔۔ کہیں آپ افسانہ لکھنے کے موڈ میں تو نہیں ہیں!۔۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے باوجود وہ مجھے اسی موضوع پر افسانہ لکھنے کی تحریک کرتی ہے۔

مجھے اب پوری طرح یقین ہو جاتا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آگیا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے اس سے پہلے ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آگیا ہوں...... پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دو سو سال پہلے تھی۔ اور جب میں دو سو سال بعد آیا تو میری آمد میں چار سو سال رہتے تھے اور پھر جب میں چار سو سال بعد آیا تو میں اپنے وقت سے آٹھ سو سال پہلے آیا ہوا تھا۔ اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آگیا ہوں۔

میں جو روشنی کی بشارت ہوں۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہو رہا ہوں وہ کون سی صفر مدّت ہے جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل از وقت نہ ہو گی۔ وہ صفر مدّت جب انسان نور کا انکار کر کے آگ کی بھینٹ نہیں چڑھے گا۔ مجھے اس مدّت کا انتظار کرنا ہو گا۔

اب جب میں سولہ سو برس کے بعد آؤں گا تو میری آمد میں بتیس سو سال رہتے ہوں گے۔ اور جب میں بتیس سو سال بعد آؤں گا تو میری آمد میں چونسٹھ سو سال رہتے ہوں گے۔ اور اسی طرح کئی ہزار برس بیت جائیں گے۔ لیکن وہ صفر مدت کب آئے گی جب میرا آنا بروقت ہو گا۔ اور جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی انی پر آجائیں گے۔ تب کوئی انکار کی جرأت نہ کر سکے گا۔ میں اپنے گزرے ہوئے اور آنے والے برسوں کا بوجھ اپنی روح پر اٹھائے پھر شہر میں آتا ہوں۔ شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر میں اعلان کرتا ہوں:

"لوگو! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لا کر خود کو روشنی سے محروم کر لیا ہے......" میرا اعلان مکمل ہونے سے پہلے ہی لوگ تمسخر شروع کر دیتے ہیں۔ مختلف سمتوں سے گالیاں اور تضحیک آمیز فقرے میری طرف آ رہے ہیں۔ میں کمالِ ضبط سے تمام

تمسخرانہ اور تضحیک آمیز فقرے برداشت کرتا ہوں۔۔جب لوگ فقرے بازی سے خود ہی تھک جاتے ہیں تو میں اپنا پہلا اعلان ادھورا چھوڑ کر نیا اعلان کرتا ہوں:

"لوگو!تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے۔نور بصیرت سے محروم لوگو!تم میں سے اب صرف وہی لوگ بچائے جائیں گے جو میرے گھر کی دیواروں کی اوٹ میں پناہ لیں گے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آگیا ہوں لیکن آگ تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔"

یہ کہہ کر میں اپنا چراغ شہر کے چوراہے پر توڑ دیتا ہوں اور خود تیزی سے اپنے گھر کی طرف چلا آتا ہوں۔لوگوں کے قہقہے گھر تک میرا تعاقب کرتے ہیں۔ لیکن میرے گھر پہنچنے تک وہ قہقہے چیخوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ مٹی کے اس چراغ سے سارے شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھ جاتا ہوں۔

سارے شہر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔اور لوگوں کی چیخیں ایک بھیانک شور میں تبدیل ہو گئی ہیں میری ماں حیرت سے کبھی میرے کمرے میں آکر مجھے دیکھتی ہے اور کبھی گھر کے صحن میں جاکر دھڑا دھڑ جلتے ہوئے شہر سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھتی ہے۔ میری چھوٹی بہن اسی طرح خوفزدہ انداز میں ماں کے ساتھ ساتھ ہے۔۔ پھر وہ ماں کو کھینچ کر میرے کمرے میں بٹھا لیتی ہے اور خود دبک کر ماں کے اور بھی قریب ہو جاتی ہے۔

مبارکہ اور عفت دونوں میرے کمرے میں آتی ہیں۔ دونوں کے چہروں سے حیرت جھلک رہی ہے۔ایک گھمبیر خاموشی کے بعد مبارکہ ہمت کر کے بولتی ہے،

"باہر بہت سارے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں"

"اب ان کا ایمان لانا یانہ لانا ایک برابر ہے۔۔ جو لوگ دیواروں کی اوٹ میں ہیں انہیں ویسے بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ میں اب بیعت نہیں لے سکتا۔۔ میں اب سولہ سو برس کے بعد آؤں گا۔ پھر بتیس سو برس کے بعد پھر چونسٹھ سو برس کے

بعد۔۔ پھر۔۔ پھر۔۔"

مبارکہ اور عفت کے چہروں سے عقیدت کے ساتھ دہشت بھی ٹپکنے لگتی ہے۔

میری چھوٹی بہن دبک کر ماں کے کچھ اور قریب ہو جاتی ہے۔

میری ماں اپنی خالی آنکھوں میں ان لمحوں کو اتارنے کی کوشش کر رہی ہے جب اس نے مجھے جنم دیا تھا اور میں اس صفر مدت کا انتظار کرنے لگتا ہوں جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوانیزے کی انی پر اتر آئیں گے۔ جب وہ اپنے گواہ آپ ہوں گے اور جب مٹی کا کوئی چراغ گواہی کے لئے نہیں لانا ہو گا۔

☯

میری ماں اور چھوٹی بہن سامنے بینچ پر بیٹھے ہیں۔ مبارکہ میری نبض دیکھتے ہوئے بتاتی ہے، "ابھی تھوڑی دیر پہلے عفت آپ کی عیادت کے لئے آئی تھی۔ مگر آپ سوئے ہوئے تھے۔ اب وہ پھر تھوڑی دیر بعد آئے گی۔"

اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں کس صفر مدت کا انتظار کر رہا ہوں!

ممتا

یہ ساری روشنی حیدرؔ رہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

میں لان میں کھڑی جہاز کو پرواز کرتے دیکھ رہی ہوں۔ اس جہاز میں میری ممی گرمیاں گزارنے سوئٹزرلینڈ جا رہی ہیں۔ ڈیڈی انہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ تک گئے ہوئے ہیں۔ زیبی اور روبی بھی ممی کے ساتھ گئی ہیں...... جہاز میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اور میں آہستہ آہستہ کوٹھی کے اندر جانے لگتی ہوں۔

ڈرائینگ روم میں آ کر میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی ہوں۔

اچانک مجھے آئینے میں ایک خوبصورت سا جہاز پرواز کرتا نظر آتا ہے...... میں تھوڑا غور سے دیکھتی ہوں...... اف فوہ...... (حیرت ہے!) اس میں اس میں...... تو میری امی کی روح پرواز کر رہی ہے۔

"امی آپ نے تو زندگی بھر ہوائی جہاز کا سفر نہیں کیا تھا، پھر موت کے بعد یہ جہاز کا سفر کیسا؟"

میں امی سے پوچھتی ہوں مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔

میں ڈرائینگ روم سے نکل کر ڈاڈر کے سینی ٹوریم میں پہنچ گئی ہوں۔

امی کو مختلف انجکشن لگائے جارہے ہیں۔ ہم سب بہن بھائی ان کے سرہانے کھڑے ہیں اور امی، ڈیڈی۔ (نہیں ڈیڈی نہیں ابو...... ڈیڈی ممی کے ساتھ ہوتے ہیں اور ،امی کے ساتھ ......)

ابو کے چہرے سے گہری تشویش جھلک رہی ہے۔ عجیب سے وسوسوں اور اندیشوں میں گھرا ابو کا چہرہ دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ مگر میں نے آج تک منہہ در منہہ کبھی ابو سے کوئی فرمائش تک نہیں کی۔ جو کچھ بھی مانگنا ہوتا امی کی معرفت مانگتی یا پھر چٹ لکھ کر مانگتی......

پھر میں اتنی جرأت کیسے کرلوں...... میں نے گھبرا کر ابو کے چہرے سے نظریں ہٹالی ہیں اور امی کی طرف دیکھنے لگی ہوں۔ امی کی بجھی بجھی آنکھوں سے میری آنکھیں چار ہوئی ہیں اور میری آنکھوں میں روشنی بھر گئی ہے۔

میں سینی ٹوریم سے واپس ڈرائینگ روم میں آگئی ہوں۔ آئینے میں اب وہ خوبصورت جہاز نظر نہیں آرہا۔ ابو...... نہیں ڈیڈی...... ڈیڈی ایئرپورٹ سے واپس آگئے ہیں، میں نے ریٹو کے ابو کو اپنے لاہور خیریت سے پہنچنے کا خط ابھی تک نہیں لکھا۔ اس لئے خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔

سوئیٹزرلینڈ سے زیبی کا خط آیا ہے۔ وہ بڑے مزے کی سیر کررہے ہیں ممی نے ڈھیروں پیار بھیجے ہیں۔ آج ڈیڈی بھی ایک ہفتہ کے لئے سوئیٹزرلینڈ جارہے ہیں۔

ڈیڈی چلے گئے ہیں اور میرے ابو میرے پاس آگئے ہیں۔

"چلو بیٹی تمہاری امی تمہارا انتظار کررہی ہوگی"

ڈاڈر کی خوبصورت وادی اور اس میں بہتا ہوا دریائے سرن کا صاف و شفاف پانی...... یہ منظر سوئیٹزرلینڈ کی کسی بھی وادی سے کم نہیں۔ لیکن ابو ان تمام نظاروں سے

لا تعلق میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے سینی ٹوریم کی طرف تیزی سے چل رہے ہیں۔ میں دو تین دفعہ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے گرنے لگتی ہوں۔ مگر ابو نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے اس لئے بچ جاتی ہوں...... ہم امی کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ سارے بہن بھائی وہاں موجود ہیں صرف زیبی نہیں ہے۔

امی پوچھتی ہیں "زیبی کہاں ہے؟"

ابو خاموش کھڑے ہیں۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ "سوئٹزرلینڈ گئی ہوئی ہے" مگر کہہ نہیں سکتی کیونکہ زیبی جو چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب کے آخر میں کھڑی تھی بڑھ کر آگے آجاتی ہے۔

امی کے سرہانے پڑے ہوئے آکسیجن کے سلنڈر دیکھ کر مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

ابو کچھ دیر کے لئے ڈاکٹر کے ساتھ باہر جاتے ہیں اور میں پھر ڈیڈی کے ڈرائینگ روم میں واپس آگئی ہوں۔ یہاں رینو کے ابو میرے منتظر ہیں۔

"کہاں گئے سب گھر والے؟"

"ممی، زیبی اور روبی دو ماہ کے لئے اور ڈیڈی ایک ہفتہ کے لئے سوئٹزرلینڈ گئے ہیں"

"تمہیں کیوں نہیں ساتھ لے گئے؟" رینو کے ابو کا لہجہ کچھ تیکھا سا ہو جاتا ہے۔

"ایک تو اس لئے کے لاہور سے سوئٹزرلینڈ شیخوپورہ جتنی دور نہیں ہے۔ دوسرے اس لئے کہ گھر پر بھی تو کسی نے رہنا تھا"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری سگی ماں زندہ ہوتی اور تم اسے اس طرح ملنے آتیں تو وہ اگلے دن تمہیں گھر چھوڑ کر کہیں سیر کو چلی جاتی؟"

"دیکھئے مجھے میری ممی کے خلاف نہ بھڑکایئے، وہ بہت اچھی ہیں۔ ہم سب کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ آپ ایسی باتیں کر کے میرے دل میں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں"

”میں تو تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں“

”مرد ہمیشہ عورت کو بہکاتا ہے اور پھر اپنی ساری غلطیوں کی ذمہ داری بھی عورت پر ہی ڈال دیتا ہے، اور عورت...... وہ اپنی سادگی کے باعث ہر ناکردہ گناہ کو بھی اپنا گناہ تسلیم کر لیتی ہے۔ آدم اور حوا سے لے کر آج تک یہی ہو رہا ہے......“

قلم گرنے کی آواز سن کر میں چونک اٹھتی ہوں۔ گرے ہوئے قلم کو اٹھا کر پھر سے ریتو کے ابو کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ جاتی ہوں...... مگر یہ کاغذ پر اب تک کیا لکھتی رہی ہوں؟

ابو۔۔ابو۔۔امی۔۔ابو۔۔ڈیڈی۔۔امی۔۔ ممی۔۔ڈیڈی۔

اپنی حماقت پر جھینپ کر پھر ریتو کے ابو کو ان کے خط کا جواب لکھ رہی ہوں۔

ڈیڈی ایک ہفتہ سوئٹزرلینڈ گزارنے کے بعد واپس آگئے ہیں۔ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈیڈی سے ہر حال میں یہ پوچھ کر رہوں گی کہ امی کی وفات کے بعد بھی آپ ایک عرصہ تک ابو ہی رہے پھر محض ممی سے شادی کے بعد آپ ڈیڈی کیوں بن گئے؟ آپ پھر سے ابو کیوں نہیں بن جاتے؟...... مگر میں جانتی ہوں کہ میں اتنی جرأت کے ساتھ تو کبھی ابو کے سامنے بھی نہ بول سکی تھی پھر ڈیڈی کے سامنے بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... شاید امی اس سوال کا جواب دے سکیں!

یہ سوچ کر میں پھر سینی ٹوریم کی طرف چل پڑی ہوں۔

ابو ابھی تک ڈاکٹر سے کوئی مشورہ کر رہے ہیں۔

میں امی کے کمرے میں داخل ہوتی ہوں۔

امی اٹھ کر بیٹھ گئی ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ...... مہاتما بدھ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی ہے۔ ہماری خاموش آنکھیں امی سے سوال کر رہی ہیں۔

امی نے بھیا کے سر پر ہاتھ پھیرا ہے۔ بھیا کی آنکھوں میں آنسو ہیں...... اب رضیہ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہیں وہ بھی اشکبار ہے۔۔ اب زیبی کو پیار کیا ہے۔ مگر وہ حیران حیران

سی، امی کو دیکھ رہی ہے۔۔ سب سے آخر میں امی نے مجھے بلایا ہے۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں تو میں انکی دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو ننھے ننھے قطرے دیکھتی ہوں۔ راکھ کے ڈھیر میں دو چنگاریاں!

میں "امی جی" کہہ کر ان سے لپٹ جاتی ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ راکھ کے اس ڈھیر میں کتنی حرارت موجود ہے۔ شاید یہ ممتا کی حرارت ہے!! ابو ڈاکٹر سے مشورہ کر کے آگئے ہیں۔

"تمہاری امی ٹھیک ہو گئی ہیں اب ہم انہیں گھر لے جائیں گے"

"امی ٹھیک ہو گئی ہیں؟"

"امی ٹھیک ہو گئی ہیں؟"

دنیا میں کتنی دفعہ معجزے ہوئے ہیں شاید اس دفعہ بھی کوئی معجزہ ہو جائے۔

ایک سپیشل ویگن آئی ہے۔ امی کو اس میں لٹایا گیا ہے۔ میں نے اپنے زانوؤں پر امی کا سر رکھ لیا ہے۔ باقی سارے بہن بھائی بھی ویگن میں بیٹھ گئے ہیں۔ ویگن ڈاڈر کے پہاڑی علاقے کے نشیب و فراز سے گزر رہی ہے۔ بلندیوں اور پستیوں کے کتنے چکر لگا رہی ہے۔ ایک جگہ ویگن نے ہچکولا کھایا ہے اور میری چیخیں نکلنے لگتی ہیں لیکن میں انہیں دبا کر صرف سسک کر رہ گئی ہوں۔ معجزوں کی امید ختم ہو گئی ہے، میں امی کی ڈھلکی ہوئی گردن کو سیدھا کرتی ہوں۔

"یہ تمہاری ممی نے تمہارے لئے کچھ تحفے بھجوائے ہیں" ڈیڈی نے دو خوبصورت سے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ہے۔

ریتو نیند سے بیدار ہو گیا ہے میں اس کے لئے دودھ بنانے لگتی ہوں۔ اسے دودھ پلا کر پیکٹ کھولتی ہوں۔

ایک پیکٹ میں میرے اور بچوں کے لئے بے حد قیمتی کپڑے ہیں دوسرے پیکٹ میں بچوں کے لئے کھلونے ہیں۔

"ارے یہ جہاز!" میں حیرت سے اس کھلونے کو دیکھتی ہوں...... یہ تو بالکل وہی ڈیزائن ہے جو مجھے آئینے میں نظر آیا تھا، جس میں میری امی کی روح پرواز کر رہی تھی۔ میں پھر صوفے پر اسی زاویے سے جا کر بیٹھ گئی ہوں مگر آئینے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ میں اٹھ کر آئینے کے روبرو کھڑی ہو گئی ہوں......

لیکن یہ کیا...... آئینے میں میری بجائے میری امی کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ ٹی بی زدہ امی نہیں۔ خوبصورت اور جوان سی۔ بیماریوں کے روگ پالنے سے پہلے والی امی۔ اس عمر کی امی جب میری عمر بمشکل چھ برس تھی......

میں چاہتی ہوں پھر سے چھ برس کی بچی بن جاؤں پھر بچوں کی طرح شرارتیں کروں۔ مار کھاؤں، ضد کروں، جھڑکیاں سنوں...... ارے ہاں میں چھ برس کی ہی تو تھی جب میں نے قرآن مجید ختم کر لیا تھا، امی کتنی خوش تھیں اس دن!۔ سارے خاندان میں امی کا سر اونچا تھا کہ میری ننھی سی بچی نے اتنی چھوٹی عمر میں کلام پاک ختم کر لیا ہے، جس دن میری "آمین" تھی امی مجھے بار بار چومتی تھیں اور پتہ نہیں کیا کیا پڑھ کر پھونکتی تھیں کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

امی ابو کو "باؤجی" کہا کرتی تھیں۔ میں نے بھی ایک بار رینو کے ابو کو "باؤجی" کہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے...... میرے سوچتے سوچتے کتنے برسوں کا فاصلہ طے ہو گیا ہے۔ آئینے میں اب امی کے خوبصورت اور جوان چہرے کی جگہ نحیف و لاغر چہرے نے لے لی ہے، مگر ٹی بی زدہ امی بھی مسکرا رہی ہیں۔

"امی آپ نے دکھ کے لمحوں کی ہر سانس میں ابو کا ساتھ دیا تھا پھر اب خوشی کے لمحوں میں کیوں منہ موڑ گئی ہیں؟"

"بیٹی! اسے مقدر کہتے ہیں" امی بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

"امی اگر اسے مقدر کہتے ہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟"

"مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے بیٹی!"

"میں ایسے ڈراؤنے مقدر کی آنکھیں پھوڑ دوں گی" میں چیخ اٹھتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی بے دم ہو کر نیچے گر جاتی ہوں۔ امی آئینے سے نکل کر باہر آتی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر مجھے مسہری پر لٹاتی ہیں اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دے کر واپس چلی جاتی ہیں۔ میں مسہری پر لیٹے ہوئے کروٹ بدلتی ہوں۔ پیشانی پر ابھی تک امی کے بوسے کا لمس جاگ رہا ہے۔ سامنے ریٹو، ممی کے بھجوائے ہوئے خوبصورت ہوائی جہاز والے کھلونے سے کھیل رہا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے میرے بڑے بچے رونی اور بڑی بچی نزہی کے کیرم کھیلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ڈیڈی کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں، ڈیڈی کچھ دیر ریٹو کے ابو کے مستقبل کے سلسلے میں باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں، امی کے بوسے کا لمس ابھی تک محسوس ہو رہا ہے۔ میں امی سے ملنے قبرستان پہنچ جاتی ہوں۔ امی کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر ابو کو تلاش کرتی ہوں۔ وہ یقیناً یہیں کہیں مجاور بن کر بیٹھے ہوں گے۔ شاید یہیں کہیں ہوں۔

میں زور سے پکارتی ہوں "ابو......ابو"

دوسری طرف کھڑے پہاڑوں سے ٹکرا کر میری آواز گونجتی ہے "ابو......وو......ابو......وو......"

میں پھر پکارتی ہوں،

پہاڑوں سے ٹکرا کر صدا پھر گونجتی ہے۔

"ابو مجھے تھام لو میں گرنے لگی ہوں"

"ابو مجھے تھام لو میں گرنے لگی ہوں......ں ں......ں ں"

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اب اپنے ابو کو نہیں پکار رہی بلکہ پہاڑوں سے سر ٹکرا رہی ہوں۔ میں پہاڑوں کو پاش پاش کر دینا چاہتی ہوں،

"ابو......ابو......"

"ابو......ابو......وو"

میں چیختے چیختے بے دم ہو گئی ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکراتے ٹکراتے ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔

میں ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ مگر پہاڑ اپنی جگہ قائم کھڑے ہیں۔

"امی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے۔ امی آپ ٹھیک کہتی ہیں...... امی...... امی...... امی ابو......" میں بالکل بکھر کر رہ گئی ہوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرے ریزوں کو جمع کر کے مجھے جوڑ رہا ہے۔ اس نے مجھے پھر سے جوڑ دیا ہے۔ اب وہ مجھے اپنے مضبوط بازوؤں پر اٹھائے قبرستان سے باہر نکل رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے "ابو" آگئے ہیں۔ اور وہی مجھے اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ میں آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں "اف فوہ...... یہ تو ریٹو کے ابو ہیں"

☯

مجھے شدید بخار ہو گیا ہے۔ ڈیڈی کو ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنا تھی اس لئے وہ جا چکے ہیں۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوں۔ اسی عالم میں دیکھتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ میری ممی میرے سرہانے بیٹھی ہیں۔ انہوں نے اپنے زانوؤں پر میرا سر رکھا ہوا ہے اور بڑے پیار سے مرا سر دبا رہی ہیں۔ مجھے اپنے خیالات پر شدید ندامت محسوس ہوتی ہے۔ میں لفظوں کو جمع کر رہی ہوں:

"ممی...... آپ تو...... ممی...... اچھی سی......" لیکن لفظ صحیح طور پر جمع ہی نہیں ہو پا رہے۔ میرے چہرے پر دو گرم گرم آنسو گرتے ہیں (ممی رو بھی رہی ہیں) میں جذبات کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔

میں اپنی آنکھیں نہیں کھولنا چاہتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے سرہانے تو میری ننھی بچی نزہی بیٹھی ہے۔ پھر بھی میں لفظوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہی ہوں،

"ممی...... میری اچھی ممی...... مجھے معاف کر دیں......"

اندھی روشنی

کب تلک چھائی رہے گی یونہی اندھی روشنی
کب تلک حیدرؔ رہیں گے ان اندھیروں کے عذاب

اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف روشنی کا سیلاب پھیلا ہوا ہے۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینے نصب ہیں جو روشنی کے سیلاب کی شدت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ میں نے عجیب سے خوفزدہ انداز میں اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔ جب بینائی کام نہ کرے تو اندھے پن کا احساس قدرتی بات ہے مگر میری تو آنکھیں بھی بالکل ٹھیک ہیں، ان کی بینائی بھی قائم ہے پھر مجھے اندھے پن کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟

وہ ایک میز پر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی ہے اور مجھے بھی بیٹھنے کے لئے کہہ رہی ہے۔ مجھے اپنی کرسی بھی نظر آ رہی ہے مگر اندھے پن کا احساس بھی بدستور موجود ہے۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا ہوں اور اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا ہوں۔

ہال میں اچانک موسیقی کا ایک شور سا اٹھا ہے۔ عجیب بے ہنگم سی موسیقی ہے۔ سارا ہال اس کی لے پر تھرک رہا ہے۔

وہ میری طرف دیکھتی ہے اور پھر مجھے جیسے گھسیٹتے ہوئے ہال کے وسط میں لے آتی ہے۔ یہاں اور بھی کئی جوڑے ناچ رہے ہیں اور اب میں بھی اس کے اشاروں پر ناچ رہا ہوں۔ لیکن "میں" تو ابھی تک اس کرسی پر گم سم بیٹھا ہوا ہوں بلکہ "میں" نے کرسی کے بازوؤں کو اس طرح مضبوطی سے تھام رکھا ہے جیسے انہیں چھوڑ دیا تو ہوا میں اڑ جاؤں گا۔ یا کسی بھیڑ میں گم ہو جاؤں گا، غالباً میں اندھیروں کا باسی ہوں اور شاید اسی لئے روشنی کے اس سیلاب میں ڈبکیاں کھا رہا ہوں...... میرے حواس کھو گئے ہیں...... مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے...... اب کرسی بھی ہچکولے کھا رہی ہے، جیسے اس نے بھی مجھے اس سیلاب میں ڈوبنے سے بچانے سے انکار کر دیا ہو۔ میرے چاروں طرف دائرے سے ناچ رہے ہیں۔

موسیقی کا شور بڑھ گیا ہے

دائروں کے رقص کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ روشنیوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی ہے اور میرے اندھے پن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی تاریک غار میں دوڑتا جا رہا ہوں۔ ہزاروں آسیب میرے تعاقب میں ہیں، اچانک مجھے ٹھوکر سی لگتی ہے۔

"دیکھو احتیاط کرو۔ میرا مذاق نہ بناؤ"

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا ہے۔ میں غار سے نکل کر واپس ہال میں پہنچ گیا ہوں اور اب پھر سنبھل کر رقص میں اس کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن "میں" تو ابھی تک اس کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ رقص کون کر رہا ہے؟ رقص بھی میں ہی کر رہا ہوں۔

پھر میں کہاں ہوں؟

میں رقص کر رہا ہوں یا کرسی پر بیٹھا ہوں؟

کرسی پر بیٹھا ہوا "میں" کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ مجھے بلا رہا ہے۔

"واپس لوٹ آؤ

شجر ممنوعہ کی داستان نہ دہراؤ۔ واپس لوٹ آؤ۔ جنت سے نکل کر تو زمین پر آ گئے تھے۔ زمین سے نکال دیئے گئے تو کوئی ٹھکانہ نہیں ملے گا...... اس حوا کو چھوڑ دو...... واپس لوٹ آؤ"

"میں" پھر کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔

میں بے اختیار کرسی پر بیٹھے ہوئے "میں" کی طرف بڑھتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھا ہوا "میں" پھر کھڑا ہو گیا ہے۔ ہم دونوں بغل گیر ہوتے ہیں اور وہ میرے اندر چھپ جاتا ہے۔ موسیقی کا بے ہنگم شور جاری ہے۔۔ رقص بھی جاری ہے۔

"وہ شاید کوئی دوسرا ساتھی ڈھونڈ چکی ہو گی" میں یہ سوچتے ہوئے ادھر دیکھتا ہوں۔

مگر وہ تو میرے سامنے بیٹھی ہے۔

اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور بے بسی کے اثرات ہیں۔

"میں تمہاری وجہ سے جنت بدر ہوا تھا مگر اب میں تمہاری وجہ سے زمین بدر نہیں ہو سکتا"

"میری وجہ سے......؟" اس کی آنکھوں میں حیرت ہے،

"تم شجر ممنوعہ تک لے جانے کی ذمہ دار ہو اور شجر ممنوعہ جنت سے نکلوانے کا ذمہ دار ہے"

"شجر ممنوعہ......! گندم......؟"

"گندم...... شاید......!"

"کیا گندم اشجار پر اگتی ہے؟"

"نہ میں عربی زبان جانتا ہوں نہ کسی تفسیری جھگڑے میں پڑنا چاہتا ہوں (جنت

میں اشجار پر ہی اُگتی ہوگی)"
"تم روشنی سے خوفزدہ ہو" اس کا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا ہے،
"پہلے بھی تمہارے ایسے ہی طعنوں نے مجھ سے گناہ کرایا تھا"
"گندم میں نے نہیں کھلائی تھی" وہ چیخ پڑتی ہے،
"میں پھر کہتا ہوں کہ میں جھگڑنا نہیں چاہتا"
"تم نے گندم کی تہمت میرے سر کیوں لگائی؟"
"میں دوبارہ فریب میں نہیں آنا چاہتا"
"فریب!...... مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا......" اس کے لہجے میں بلا کا طنز ہے...... "اپنی عیاشی کا سامان بھی پورا کرتا ہے اور اپنی ساری غلطیوں کا بار بھی عورت پر ہی ڈالتا رہتا ہے"
"لیکن گندم......"
"سنو!"...... وہ چلاتے ہوئے بولتی ہے "گندم کی ہیئت پر غور کرو اور اپنی اس کمزوری پر بھی غور کرو جس کے بغیر تم نہیں رہ سکتے۔ بڑے بڑے تجرد پسند بھی جس کے لئے بالآخر مجبور ہو گئے"
"تم فحش اور ننگی باتیں کر رہی ہو"
"سچ کا کوئی لباس نہیں ہوتا اسی لئے ننگا نظر آرہا ہے"
اس کا لہجہ بے حد زہریلا ہے اور میں ایک بار پھر اندھے پن کے احساس میں کھو گیا ہوں۔
"اندھیروں کے باسی تم اب بولتے کیوں نہیں"
اچانک ساری روشنیاں گل ہو گئی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے، وہ گھبرا کر میرے قریب ہو جاتی ہے۔
"تم جس مصنوعی روشنی کی باسی ہو اس کا طلسم ٹوٹ جائے تو پھر دیکھ لو

کیا ہوتا ہے "میں اس سے یہ کہنا چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا کیونکہ روشنیاں پھر آگئی ہیں۔ میرا اندھا پن بھی آگیا ہے۔

اب ہماری میز پر ایک اجنبی بھی موجود ہے اجنبیت کے باوجود ہمیں اس میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ "شاید میں آپ لوگوں کی بحث کو کسی حتمی نتیجے تک پہنچا سکوں!" اجنبی پر خلوص لہجہ میں کہتا ہے۔

"ہماری بحث کا موضوع جنت بدر ہونے کا سبب یعنی گندم ہے "میں وضاحت کرتا ہوں۔

"کیا واقعی تمہیں جنت بدر کرنے کا سبب گندم ہی ہے؟"

"مجھے یاد تو کچھ ایسے ہی پڑتا ہے "میں ذہن پر زور دیتے ہوئے بتاتا ہوں۔

"مولوی صاحبان بھی یہی بتاتے ہیں "وہ میرے موقف کی تائید کرتی ہے۔

"مجھے شک پڑتا ہے آپ نے گندم کی بجائے اس کا بھوسہ کھالیا ہوگا"

اجنبی کی اس بات پر ہم احمقوں کی طرح ہنستے ہیں۔

"ذہن پر زور دیجئے......وہ گندم سرخ رنگ کی تو نہیں تھی؟" اجنبی سوال کرتا ہے......پھر ایک بھرپور قہقہہ لگاتا ہے اور خود بھی اس قہقہے میں گم ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ہی جیسے نیند سے بیدار ہو گئے ہیں۔

"سرخ گندم کا مطلب سمجھتی ہو؟"

"اوہ......اب سمجھی......اس کا اشارہ امریکی گندم کی طرف تھا"

"سالا کوئی کمیونسٹ معلوم ہوتا تھا"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں"

آج صبح کے اخبارات میں قوم کو یہ نوید سنائی گئی ہے کہ قحط کے خطرے کے پیش نظر ایک دوست ملک سے طویل مدت قرض کی بنیاد پر کئی ہزار ٹن گندم خریدنے کے ایک

معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں۔

میرے اندر کا "میں" سورج نکلنے سے پہلے ہی مر گیا ہے۔

میں پھر اپنی حوا کو ملنے چلا گیا ہوں

پھر وہی روشنیاں ہیں...... وہی موسیقی ہے اور وہی رقص ہیں۔ میری وہ کرسی اب خالی پڑی ہے

یہ روشنیاں اب مجھے راس آگئی ہیں۔

اور میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے۔

اب میں اس کے اشاروں پر نہیں ناچ رہا بلکہ اسے اپنے اشاروں پر نچا رہا ہوں......

لیکن یہ کیا......؟

سامنے دیوار پر نصب آئینے میں میرے اندر کے "میں" کی بے کفن لاش مجھے گھور رہی ہے۔

میں گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہوں۔ لیکن ادھر بھی بڑا آئینہ نصب ہے اور اس میں بھی وہی منظر ہے میرے چاروں طرف میری لاشیں بکھری ہوئی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں:

"کاش میرا وہ اندھا پن ہی لوٹ آئے"

موسیقی کا شور کچھ اور بڑھ گیا ہے۔

ہمارے رقص کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔

لیکن ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ ہم بے زمین ہو گئے ہیں۔ صرف اپنی لاشوں پر کھڑے رقص کر رہے ہیں۔

روشنیاں تیز ہو گئی ہیں۔

موسیقی کا شور مزید بڑھ گیا ہے

اور رقص کی رفتار مزید تیز ہو گئی ہے۔

تیز...... تیز......اور تیز

روشنیاں موسیقی اور رقص

بے زمین لوگوں کا اپنی لاشوں پر رقص۔

حوّا کی تلاش

مرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں کس رُت میں کیسے خواب لگے

مجھے یقین نہیں آرہا۔
میں عالم برزخ میں ہوں،
عالم خواب میں ہوں،
یا عالم حقیقت میں ؟

''غالباً میں عالم حقیقت میں ہوں'' کسی وہم کی طرح مجھے یقین ہو جاتا ہے اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہتا ہوں پھر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

میرا مستقبل میرے داہنے ہاتھ پر اور میرا ماضی میرے بائیں ہاتھ پر ہمیشہ رقم رہتا تھا اور میں اپنے ماضی اور مستقبل کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ حال میں رواں رہتا تھا۔ مگر اب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو مجھے وہاں چاروں طرف

دھند چھائی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو وہاں دھواں دھواں فضاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ بے چارگی کے احساس کے ساتھ میں نے اپنے حال کی طرف دیکھنا چاہا تو مستقبل کی ساری دھند میری آنکھوں میں اُتر آئی اور ماضی کا سارا دھواں میرے چاروں طرف رقص کرنے لگا۔ اس عذاب ناک حالت میں مجھے بچپن کی وہ دعائیں بھی بھول گئیں جو میری ماں نے مجھے یاد کرائی تھیں۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوا۔ آخر دھوئیں کا رقص دھواں ہونے لگا۔ روشنی کی ایک لکیر ابھری اور ابھرتی چلی گئی،

"الم تر کیف فعل ربک با اصحاب الفیل"

دھند میری آنکھوں سے چھٹنے لگی اور دھواں دور ہٹنے لگا۔ مجھے اصحاب فیل کا انجام یاد آیا جو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے سامنے بکھرے ہوئے ایٹم بم کا شکار ہونے والے منظر کو دیکھا اور مجھے اصحاب فیل کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا جو صرف کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیئے گئے تھے۔

عالمگیر ایٹمی جنگ ہو چکی ہے اور میں پتہ نہیں کیسے زندہ بچ گیا ہوں۔ میرے چاروں طرف اس بھیانک جنگ کے اندھیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ مجھے ان اندھیروں سے نکلنے کے لئے روشنی درکار ہے۔ اور تب ہی جس قوت نے مجھے اس جنگ میں بھی زندہ رکھا تھا۔ مجھے روشنی عطا کرنی شروع کر دی۔ روشنی کی جو لکیر پہلے ابھری تھی وہ اب ایک روشن ہالے کی شکل اختیار کر گئی ہے اور مجھ پر کرن کرن اتر رہی ہے،

"تجھے کیا معلوم ہے کہ حطمہ (ایٹم) کیا شے ہے؟ یہ اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کے اندر تک جا پہنچے گی تا کہ اس کی گرمی ان کو اور بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہو"

"دنیا پر ایک شدید مصیبت آنے والی ہے اور تجھے کیا معلوم ہے کہ وہ مصیبت کیسی ہے؟ اور ہم پھر کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ عظیم الشان مصیبت کیا چیز ہے؟ یہ مصیبت جب آئے گی تو اس وقت لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ اس پشم کی مانند ہو جائیں گے جو دھنکی ہوتی ہے۔"

"جب زمین کو پوری طرح ہلا دیا جائے گا۔ اور زمین اپنے بوجھ نکال کر پھینک دے گی اور انسان کہہ اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟"

مجھے یاد آتا ہے کہ میں ایک پہاڑی علاقہ میں ٹھہرا ہوا تھا جب ایٹمی جنگ چشم زدن میں چھڑ گئی تھی مگر اب کہیں بھی کوئی پہاڑ نظر نہیں آ رہا۔ میں خود ہی حیرت سے پکار اٹھتا ہوں "یہ کیا ہو گیا ہے؟" اور قرآن کی صداقت کا ایک گواہ بن جاتا ہوں۔

مجھے یاد آتا ہے۔ دو بہت بڑی قوتیں ساری دنیا پر پھیل رہی تھیں۔ ان میں مشرقی قوت کا جال زیادہ پھیلا ہوا تھا لیکن مغربی قوت بھی کم نہ تھی عجیب عجیب نعرے تھے۔ عجیب عجیب نظریات تھے۔ دونوں ہی انسانیت کی فلاح کی باتیں کرتے تھے اور اب دونوں ہی انسانیت کی تباہی کا موجب ہو گئے تھے جنگ کی ابتدا مشرق وسطیٰ سے ہوئی تھی۔ وہاں کی تیل کی دولت۔ جسے دونوں بڑی قوتیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ پھر کیا ہوا؟۔۔ مجھے واقعات کا علم نہیں۔ لیکن روشنی کا جو ہالہ مجھ پر کرن کرن اتر رہا ہے وہ مجھے بتانے لگتا ہے۔ اس کا اپنا انداز بیان ہے،

"خداوند کہتا ہے کہ میں نے اپنی غیرت سے اور قہر کی آتش سے کہا یقیناً اسی دن اسرائیل کی سرزمین میں ایک زلزلہ ہو گا۔ یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے پرندے اور زمین کے چرندے اور سارے کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے پھرتے ہیں اور سارے انسان جو روئے زمین پر ہیں میرے سامنے تھرتھرا جائیں گے اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور کڑاڑے بیٹھ جائیں گے اور ہر ایک دیوار زمین پر گر پڑے گی...... ایک شدت کا مینہ اور بڑے بڑے اولے اور آگ اور گندھک برساؤں گا۔ اسی طرح میں اپنی بزرگی اور تقدیس کراؤں گا اور بہتیری قوموں کی نظروں میں پہچانا جاؤں گا اور وہ جانیں گے کہ خداوند میں ہوں"

"دیکھ میں ترا مخالف ہوں اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار اور میں تجھے پلٹ دوں گا...... اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لئے دوں گا۔ تو کھلے ہوئے میدان میں گر پڑے گا...... اور میں ماجوج پر اور ان پر

جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا...... اور آگے کو میں ہونے نہ دوں گا کہ وہ میرے پاک نام کو بے حرمت کریں"

"اور دنیا میں ایک حشر برپا ہو جائے گا اور وہ اول الحشر ہو گا اور تمام بادشاہ آپس میں ایک دوسرے پر چڑھائی کریں گے اور ایسا کشت و خون ہو گا کہ زمین خون سے بھر جائے گی اور ہر ایک بادشاہ کی رعایا بھی آپس میں خوفناک لڑائی لڑے گی۔ ایک عالمگیر تباہی آوے گی اور ان تمام واقعات کا مرکز ملک شام ہو گا"

"اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں اور اے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں"

میں خدا کی بزرگی اور تقدیس کا اقرار اور اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہوں۔ روشنی کی کرنیں میرے جسم پر تو اتر رہی ہیں مگر روح تک نہیں پہنچ پاتیں۔ شاید اسی وجہ سے میں صرف اپنے ماضی کی تحریریں ہی پڑھ سکا ہوں۔ مستقبل کی تحریروں کی یا تو زبان بدل گئی ہے یا انہیں پڑھنے کی میری قوت سلب ہو گئی ہے۔

ایٹمی جنگ نے آدم کی نسل کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہے اور اب ابن آدم ہونے کے ناطے اس وقت مجھے اپنا سب سے پہلا فریضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو آدم کی نسل کو اس دھرتی پر قائم رکھا جائے۔ شاید میں اس نئے عہد کا آدم ہوں۔

مگر نئی حوا۔؟

میں خدا کی تسبیح و تحمید کرتے ہوئے نئی حوا کی تلاش کے سفر پر روانہ ہوتا ہوں راستے میں تباہیوں کے کئی بھیانک منظر آتے ہیں۔ روشنی کا وہ ہالہ میرے ساتھ ہے اور اب بھی کرن کرن میرے جسم پر اتر رہا ہے۔ میرا نامعلوم اور ان دیکھا سفر جاری ہے۔ ایک جگہ تو تباہی کا ایسا منظر آتا ہے جیسے یہاں ایک دم بیسیوں ایٹم بم گرا دیئے گئے ہوں میں خوف زدہ ہو

جاتا ہوں۔اور اس منظر سے چھپنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

تب ہی روشنی کے ہالے کی کرنیں میری آنکھیں کھول دیتی ہیں،

''کیا یہ زمین میں نہیں پھرے کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا؟ وہ ملک میں ان سے تعداد اور طاقت میں بھی زیادہ تھے اور عمارت وغیرہ کے فنون میں بھی زیادہ ماہر تھے۔ لیکن ان کے اعمال نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا تھا۔اور جب ان کے پاس ان کے رسول نشانات لے کر آئے تو ان کے پاس جو تھوڑا بہت علم تھا اس پر فخر کرنے لگے اور جس عذاب کی ہنسی اڑاتے تھے اسی نے ان کو گھیر لیا۔ پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہہ اٹھے ہم تو اللہ کو ایک قرار دیتے ہوئے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے ساتھ جن چیزوں کو ہم شریک قرار دیا کرتے تھے ان کا ہم انکار کرتے ہیں۔ پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ یہی اللہ کی مقررہ سنت ہے جو اس کے بندوں میں جاری چلی آتی ہے''۔

میں تہیہ کرتا ہوں کہ مجھ آدم سے جو نسل چلے گی اسے میں ان صحیفوں کی تعلیمات کے مطابق خود تربیت دوں گا اور میری نسل شیطان کے چنگل میں دوبارہ اس طرح نہیں آئے گی کہ خدا کے عذاب کا شکار ہو جائے۔ نسل کی تربیت کے احساس کے ساتھ اپنے جیون ساتھی کی تلاش کا خیال پھر شدت سے ابھرتا ہے۔ میرے لئے اب رات یا دن کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے کہ روشنی کا ہالہ اگر میرے ساتھ نہ ہو تو میرا دن بھی تاریک ہو جائے۔ جب بھی کہیں تھکن کا احساس ہوتا ہے ٹھہر جاتا ہوں، ستا لیتا ہوں۔ شاید نیند بھی کر لیتا ہوں یا صرف اونگھ لیتا ہوں۔ میں بدترین تباہی کے اس علاقہ سے تیزی سے نکلنے لگتا ہوں پتہ نہیں ان دہشت ناک مناظر کے خوف سے یا جیون ساتھی کی تلاش کے خیال سے جو پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

جب میں اس علاقہ سے باہر آتا ہوں تو مجھے پہلی دفعہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے کئی دنوں کی مسلسل مسافت کے باوجود کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ بھوک کا احساس بیدار ہو جائے

تو اسے سلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بھوک کا احساس میرے جسم کے ساتھ ذہن اور روح پر بھی تھکن طاری کرنے لگتا ہے۔

میں چل رہا ہوں مگر مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ میرا سارا وجود شل ہونے لگتا ہے۔ میں اپنی بے بسی کے اقرار کے ساتھ خدا کی عظمت اور بزرگی کا اقرار کر کے اس کی تسبیح اور تحمید کرتا ہوں۔ تب ہی روشنی کے اس ہالے سے ایک کرن میرے جسم پر کسی تیر کی طرح اترتی ہے اور مجھ پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے،

"کیا انسان کو معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو ایک حقیر قطرہ سے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ سخت جھگڑالو بن جاتا ہے اور ہماری ہستی کے متعلق باتیں بنانے لگ جاتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔"

میں خدا کے جلال کے آگے جھک جاتا ہوں۔ لبوں سے یا دل سے کوئی دعا نہیں نکلتی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک جھڑی ہے جو تسبیح کے دانوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہے۔ یہ آنسو اپنی بے بسی اور خدا کی عظمت کا خاموش اقرار ہیں۔

میں کتنی دیر تک اسی کیفیت میں سر بسجود رہتا ہوں۔ جب دل کا بوجھ کسی حد تک اتر جاتا ہے تو سجدے سے سر اٹھاتا ہوں۔ بھوک کی شدت میں بڑی حد تک کمی ہو گئی ہے اور تھکن کا احساس بھی ایک حد تک زائل ہو گیا ہے۔ میں پھر اپنے سفر پر روانہ ہوتا ہوں۔ چلتے چلتے مجھے دور کہیں ہریالی کا گمان ہوتا ہے۔ میں بے ترتیب راستوں سے اسی سمت چل پڑتا ہوں۔

یہ تو کوئی خاصا زرخیز علاقہ ہے۔ دور دور تک ہرے بھرے کھیت ہیں اور کھیتوں کے ساتھ ہی ایک خوبصورت سا باغ بھی ہے۔ باغ بڑے جدید انداز میں آراستہ ہے۔ درمیان میں ایک خوبصورت فوارہ بھی لگا ہوا ہے۔ اس خوبصورت باغ میں پہنچ کر تھکن تو دور ہو گئی مگر بھوک نے مزید شدت اختیار کر لی لیکن فوارے کے ٹھہرے ہوئے پانی میں مچھلیاں دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا ہوں۔

کھیتوں کے ہرے بھرے راستے سے لے کر اس باغ تک مجھے کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔

ذہن پر زور دیتا ہوں تو یاد آتا ہے راستے میں کچھ جانور مرے پڑے تھے۔ مگر چونکہ میں اس سے زیادہ بھیانک تباہیوں سے گذر کر آیا تھا اس لئے میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقہ پر زہریلی گیس کے بم پھینکے گئے تھے۔ تمام ذی روح مر چکے ہیں اور ساری فصلیں اور پھل زہریلے ہو چکے ہیں۔

روشنی کا وہ ہالہ بدستور اپنی کرنیں میرے جسم پر اتار رہا ہے۔ میں عجب گومگو کی حالت میں ہوں۔ بھوک اب اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ مجھے لگتا ہے اگر میں نے کچھ نہ کھایا تو موت سے نہیں بچ پاؤں گا۔ مگر سارے پھل زہریلے ہو چکے ہیں۔

''مرنا ہی ہے تو بھوکے پیٹ کیوں مرا جائے'' یہ سوچ کر بالآخر میں نے پھلوں کو توڑ توڑ کر کھانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں میں کب تک پھل توڑ کر کھاتا رہا ہوں۔ ہوش تب آیا جب میں فوارے کا زہریلا پانی پی کر باہر آیا۔

اب میں اطمینان سے اپنی موت کا منتظر ہوں۔ مگر مجھے تو حیرت انگیز طور پر اپنے اندر توانائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ روشنی کا ہالہ اب کتنی ہی کرنیں میرے جسم پر اتار رہا ہے،

''وہی ہے جو مایوسی کے بعد بارش اتارتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے۔''

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ اس حال میں کہ تو اسے پسند کرنے والا بھی ہے اور اس کا پسندیدہ بھی۔''

میں ایک بار پھر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں جہاں سے بچایا گیا ہوں وہاں کے تابکاری اثرات میرے اندر کچھ اس طرح سرایت کر چکے ہیں کہ وہ میری ہلاکت کی بجائے اس زہریلی گیس کی ہلاکت کا باعث بن گئے ہیں جو اس وقت موجود پھلوں اور پانی میں ہے۔ گویا وہ تابکاری اثرات اس طرح میری بقا کی ضمانت بن گئے

ہیں۔ غالباً اسی لئے میں کتنے ہی متعفن مقامات سے گزرنے کے باوجود بیمار بھی نہیں ہوا اور یہ جو اتنی قوت مجھ میں آگئی ہے کہ میں سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک آ پہنچا ہوں یہ بھی ان اثرات کے سبب سے ہی ہے۔

"پس تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔"

میں اپنی خوراک کے مسئلے سے اب بالکل مطمئن ہو جاتا ہوں۔ مجھے اب ان دو بڑی مشرقی اور مغربی قوتوں کے انجام کا خیال آتا ہے۔ دونوں قومیں ہی فتنے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں۔ روشنی کا ہالہ میرے قریب آجاتا ہے اور پھر کرن کرن میرے جسم پر اترنے لگتا ہے

یکایک روشنی کا ہالہ پورے کا پورا میرے جسم پر اتر آتا ہے،

"تم پر آگ کا ایک شعلہ گرایا جائے گا اور تانبا بھی گرایا جائے گا پس تم دونوں ہر گز غالب نہیں آسکتے اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔"

روشنی کا ہالہ پھر اپنے اصل فاصلے پر چلا جاتا ہے اور پھر کرن کرن میرے جسم پر اترنے لگتا ہے۔ میں دونوں بڑی قوتوں کی تباہی کا یقین کر لیتا ہوں۔

جیون ساتھی کی جستجو کا خیال پھر مجھے مستعد کر دیتا ہے۔ اور میں نیا آدمی ہونے کے ناطے بقائے نسل انسانی کے مقدس فرض کی خاطر ایک نئے عزم کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔

باغ والے اس گاؤں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک شہر آباد ملتا ہے۔ ساری عمارتیں سلامت ہیں مگر شہر پر موت کی حکمرانی ہے۔ دوکانیں کھلی ہوئی ہیں مگر لوگ نیچے گرے ہوئے ہیں۔ کہیں دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے ہیں بیشتر دوکاندار کاؤنٹر پر یوں سر رکھے ہوئے ہیں جیسے آرام کر رہے ہوں۔

مجھے بچپن کی وہ کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک شہزادہ ایک ایسے شہر میں داخل ہوتا ہے جہاں ہر آدمی پتھر کا بت بنا ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے میں بھی کوئی شہزادہ ہوں۔ مگر

کہانی والے شہزادے کو اس شہر کو زندہ کردینے میں اس لئے آسانی ہوتی ہے کہ وہ کسی جادوگر کے طلسم کے باعث ایسا ہوا ہوتا ہے۔ جب کہ یہ شہر تو انسان کے اپنے ہی طلسم کا شکار ہو گیا ہے۔ زہریلی گیس کے بموں نے سارے شہر میں کوئی ذی روح نہیں چھوڑا۔

میں کسی تھکے ہارے افسردہ شہزادے کی طرح ایک خوبصورت ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہوتا ہوں۔ مگر ایک دم گھبرا کے پیچھے پلٹنے لگتا ہوں۔ سامنے کوئی وحشت زدہ آدمی کھڑا ہے۔ میں پیچھے ہٹتے ہوئے پھر رک جاتا ہوں۔ سامنے تو بڑا سا قد آدم آئینہ نصب ہے۔

''تو کیا...... ؟ کیا...... یہ ...... میں ہوں؟'' میں خود کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہوں۔ مگر بالآخر مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ میں ہی ہوں۔ اپنی پہچان کو تسلیم کرتے ہی مجھے پہلی دفعہ اپنی برہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں آئینے میں مجھے بالکل اپنے ہی جیسی ایک وحشت زدہ عورت نظر آتی ہے۔ میں تیزی سے پلٹتا ہوں۔ اپنی تمام تر وحشت کے باوجود اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ وہ مغربی عورت ہے۔ اس کی آنکھوں میں تلاش اور تجسس ہے۔ وہ مجھے حیرانگی سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ پتہ نہیں اپنے باپ کو تلاش کر رہی ہے۔ بھائی کو تلاش کر رہی ہے یا بیٹے کو...... اس کی آنکھوں میں یکایک چمک پیدا ہوتی ہے۔ جیسے اس نے پہچان لیا ہو۔ اور پھر وہ دوڑ کر مجھ سے بری طرح چمٹ کر سسکنا شروع کر دیتی ہے۔ میں نہیں جانتا اس نے مجھے باپ سمجھا ہے۔ بھائی سمجھا ہے۔ بیٹا سمجھا ہے یا کوئی اور۔۔ لیکن میں مطمئن ہوں کہ اب آدم کی نسل اس دھرتی سے ختم نہیں ہو گی۔

میرے ماضی اور مستقبل کی تحریریں میرے دائیں بائیں ادب کے ساتھ کھڑی ہیں۔ اور میرا ''برہنہ حال'' میرے برہنہ جسم سے چمٹا مشرق اور مغرب کی نفرتوں کو اپنے آنسوؤں سے صاف کر رہا ہے۔

روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے،

''اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

اپنی تجرید کے کشف کا عذاب

راستے تو کھو چکے تھے اپنی ہر پہچان تک
ہم جنازے منزلوں کے خود اُٹھا کر آئے ہیں

میں ایک فنکار ہوں۔

ایک مصور ہوں۔

اپنی ذات کی دریافت کے لامتناہی عمل سے گزرتے ہوئے جب میں اپنی تجرید کے کیف آور لمس سے آگاہ ہوا تو اپنے اس کشف پر میں خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

میں نے اس لمس کو اپنی روح میں اتار لینا چاہا۔ مگر عجیب بات تھی کہ میں اس کے سرور میں بھیگا ہوا تھا پر اسے چھونے کی صلاحیت سے محروم تھا۔

''یہ کیسا کشف ہے...... یہ کیسا گیان ہے؟'' میں نے خود سے پوچھا۔

''خارجی دنیا کو بھی تمہارے اس کشف کا ادراک ہونا چاہئے'' ایک مقدس آواز ابھری اور پھر ڈوب گئی۔

میں ایک مصور ہوں۔

رنگوں کی دنیا کا بادشاہ۔

رنگ جو روشنی کا اظہار کرتے ہیں۔

لفظوں میں ڈھل جائیں تو عظمتوں کے مینار بنتے ہیں۔

تاروں پر گریں تو زندگی کے سارے راز آشکار ہوتے ہیں۔

رنگ۔۔ جن سے آرٹ کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

تب میں نے اپنے فن پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی سوچ کے کینوس پر ایک شاہکار بنانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے مرحلے میں میں نے لفظوں کے سرخ رنگ سے اپنی تجرید کو پینٹ کرنا شروع کیا۔

گہرا سرخ، ہلکا سرخ، گلابی، عنابی

میں تصویر بنانے میں مگن تھا لیکن جب تصویر بنانے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ ساری سرخی آہستہ آہستہ سفیدی میں ڈھل رہی تھی۔ خون سفید ہونے کا محاورہ تو سننے میں آیا تھا مگر یہ رنگ؟۔۔ لیکن خون بھی سفید کب ہوتا ہے۔ خون تو سرخ ہی ہوتا ہے اور جو سفید ہوتا ہے اسے خون نہیں کہتے۔

رنگوں کی ساری سرخی سفیدی میں ڈھل چکی ہے اور مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ محاورتاً سہی (اور یہ محاورہ بھی غلط سہی) میرا خون سفید ہو چکا ہے۔ میں اپنے جسم سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کی دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ جاتا ہوں...... دہشت زدہ ہو کر خود کو دیکھنے لگتا ہوں۔

تب میری تجرید کے انکشاف کا وہی لمحہ دوبارہ میرے اندر جاگتا ہے۔ حالانکہ یہ کشف بھی وہی ہے، لمس بھی وہی۔ مگر اس دفعہ اس میں ایک نئے ذائقے، نئی لذت اور نئے سرور کا احساس ہوتا ہے۔ شاید اسی احساس کے باعث میں اپنی تجرید کو پھر کینوس پر منتقل کرنے لگتا ہوں۔ پہلی تصویر کے رنگ اگرچہ سفید ہو چکے ہیں تاہم ان رنگوں کی مہک ابھی

تک موجود ہے اور کہیں کہیں مدھم مدھم مٹتے ہوئے سے سرخ نشان بھی موجود ہیں۔

اب میں سبز لفظوں کے رنگ سے پینٹ کر رہا ہوں۔

گہرے سبز، آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے، ہرے بھرے کھیتوں جیسے رنگ مقدس دھرتی پر بکھرے ہوئے بیسیوں مقدس رنگوں جیسے مقدس رنگ۔ میں ایک گونہ مسرت اور روحانی انبساط سے سرشار پینٹ کر رہا ہوں۔

مگر یہ کیا؟۔۔ میں خوف سے اپنی آنکھیں میچ لیتا ہوں۔

اور وہ میری اندر کی آنکھوں سے میرے اندر اُتر آتی ہے۔

میں بے بس ہو کر آنکھیں کھول دیتا ہوں اور وہ میرے اندر سے نکل کر پھر سامنے آجاتی ہے۔

مجھے یقین نہیں آرہا۔ میں کلر ٹیوب کو چیک کرتا ہوں۔ اس پر "سبز" لکھا ہوا ہے۔

"پھر یہ کینوس پر ہریالی کی بجائے پیلاہٹ کہاں سے آگئی؟ میں جیسے اپنے آپ سے ہی پوچھتا ہوں۔ پھر کلر ٹیوب کو ایک ہاتھ میں لے کر دباتا ہوں۔ ڈھیر سارا رنگ نکل کر فرش پر گرتا ہے اور میری خاموش چیخیں اس میں گھل جاتی ہیں۔ ٹیوب کے اندر سارا پیلا رنگ بھرا ہوا ہے۔

ہری ٹیوب میں پیلا رنگ۔ مگر سرخ ٹیوب سے تو سرخ رنگ ہی نکلا تھا۔ پھر وہ کیسے سفید ہو گیا؟۔ میں اپنے کشف میں اس خارجی دنیا کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں مگر یہاں رنگ ہی میرا ساتھ نہیں دے پا رہے۔ مجھے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ بے چارگی اور مایوسی کے اندھیرے چاروں طرف رقص کر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے میرے اندر والے فنکار کو قتل کر دیا ہے اور میں اپنی لامتناہی تلاش کے سفر میں ایک ایسے ٹیلے پر کھڑا ہوں جس کے ایک طرف سر بفلک دشوار گزار پہاڑ ہیں اور دوسری طرف گہرا ناقابل عبور سمندر۔ ایک طرف سینکڑوں اژدھوں اور عفریتوں کی پھنکاریں ہیں تو دوسری طرف آبی بلاؤں کی چیخیں! میں اپنے آپ کو پکارنا چاہتا ہوں مگر میری صدا بھی کہیں کھو گئی ہے۔

میں ٹیوبوں کو ایک ہی برتن میں خالی کر دیتا ہوں۔

سبز، سرخ، پیلا، نیلا، نسواری۔ پتہ نہیں کون کون سے رنگ ہیں۔

سارے رنگوں کو گھول کر میں اپنی انگلیوں کو کینوس پر وحشیانہ انداز میں پھیرنا شروع کر دیتا ہوں۔

سارے رنگ انتہائی بھونڈے طریقے سے کینوس پر مل دیتا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی جیسے میری ساری دیوانگی ختم ہو جاتی ہے۔ سارا وحشیانہ پن ختم ہو جاتا ہے۔

اب میری حیرت کا دوسرا رُخ بیدار ہوتا ہے

کینوس پر میری وہ تجرید کسی بھرپور شاہکار کی طرح موجود ہے۔

میں اس کا مفہوم ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں اور معنویت کے سرے بے معنویت سے ملاتا ہوں۔ تب میری تجرید کی ساری معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے۔۔ یہ معنویت اتنی گھناؤنی اور مکروہ ہے کہ میں کسی کو بھی اس سے آگاہ کر کے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ معنویت صرف میری نہیں۔ ہم سب کی ہے۔

شاید اسی لئے وہ مقدس آواز بھی اب نہیں آرہی ہے جس نے کہا تھا:

"خارجی دنیا کو بھی تمہارے اس کشف کا ادراک ہونا چاہیے!"

بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

یہ کہانی اس عجیب و غریب لمحے سے شروع ہوتی ہے جب تقدیر کے بارے میں میرے شکوک یقین کی حد تک پختہ ہو چلے تھے۔ اسی لمحے میں تقدیر کو ایک ڈھونگ سمجھ کر اسے سرمایہ داروں کا استحصالی ہتھکنڈہ قرار دینے ہی والا تھا کہ کسی نامعلوم قوت نے اس لمحے کو منجمد کر دیا اور میں شک اور ایمان کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا۔

ملک میں حکومت کی تبدیلی سے پالیسیوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ پہلے مزدوروں کو جتنی بے جا چھوٹ دی گئی تھی اب اس سے بھی زیادہ بے جا گرفت ہو رہی تھی۔ اس حد تک کہ میں جو مزدوروں کی بے جا چھوٹ کے عہد میں اپنی مزدور یونین کا معتوب مزدور تھا۔ مجھے اس یونین کا سرگرم رکن بن جانا پڑا۔ اس لئے کہ مسئلہ میری ذات کا

نہ تھا مزدور کے اجتماعی مفاد کا تھا۔ انہیں دنوں ایک اور صنعتی ادارے میں ایک معمولی سے بہانے کی آڑ میں سینکڑوں مزدوروں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ یہ حکومت کی طرف سے ملک کے تمام مزدوروں کو بھرپور عملی دھمکی تھی۔ مزدور اس دھمکی سے مرعوب ہونے کی بجائے مزید اشتعال میں آ گئے۔ تاہم سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے۔ اس صورت حال میں جب میری اپنے چیف کے ساتھ ٹھن گئی تو غیر متوقع طور پر انہیں کئی دفعہ میرے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ میری ان غیر متوقع کامیابیوں نے میرے اس شک کو مزید تقویت پہنچائی کہ تقدیر کا شوشہ سرمایہ داروں اور استحصالی قوتوں کی اختراع ہے۔

میں شک اور ایمان کے درمیان اس منجمد لمحے میں معلق تھا جب روشنی کی ایک کرن مجھ پر اُتاری گئی۔ اس کرن نے مجھے مقدر کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ لیکن جب اس نے یہاں تک کہا کہ دانے دانے اور قطرے قطرے پر نام لکھ دیا جاتا ہے تو مجھے اپنے شدید اختلاف کا اظہار کرنا پڑا۔ تب اس کرن نے مجھے پانی کے ایک قطرے کی بابت علم دیا کہ اس پر میرا نام لکھا گیا ہے۔۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس قطرے کی پہچان اور اس کے ذائقے سے آگاہی کی خاص قوت بھی دی گئی۔۔ روشنی کی اس کرن نے واپس جاتے ہوئے کہا:

”تمہیں اس امر کی کھلی چھٹی ہو گی کہ تم اس قطرے پر لکھی تحریر کو مٹا سکو“

ملز کا صنعتی امن سخت خطرے میں ہے۔ ملز انتظامیہ جھلاہٹ کا شکار ہے۔ ادھر ہماری پے در پے کامیابیوں نے ہمارے حوصلے بھی بلند کر رکھے ہیں نتیجتاً کسی مفاہمت کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔۔ اپنے چیف کو میں نے زچ کر کے رکھ دیا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے کئی خوشنما لالچ بھی دیئے گئے مگر میں لیڈری کی دھن میں مست چلا جا رہا ہوں۔ لیکن ایک اچانک اور غیر متوقع حادثے نے مجھے منتشر کر کے رکھ دیا۔ ملز انتظامیہ کا پورا بورڈ بیٹھا ہوا تھا جب مجھے بلایا گیا۔۔ وہاں ملز کے جنرل مینجر نے صنعتی گڑبڑ کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ڈالتے ہوئے

مجھے انتہائی غلیظ اور لچر گالیاں دیں۔ میں اپنی ڈیوٹی کی جگہ پر نہیں تھا اس لئے بہت کچھ کر سکنے کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکا۔ صبر و تحمل سے گالیاں کھا کر لوٹ آیا۔

ملز میں پے در پے کامیابیوں کے بعد یہ میری پہلی اور بھرپور ناکامی تھی۔

......

ملز کے بیکنگ ہاؤس کے انچارج نے جو خود بھی یونین کا سرگرم رُکن تھا۔ میرے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ چائے منگوائی۔ اور پھر ہم آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ قطرہ جس پر میرا نام لکھا تھا اس چائے میں موجود تھا۔ میں نے کچھ دیر اُسے غور سے دیکھا۔ سوچا۔ اور پھر چینی کی ایک بوری پر پورے کپ کو اس طرح انڈیل دیا کہ وہ قطرہ بھی اس میں جذب ہو جائے۔

میرا مزدور ساتھی مجھے ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔

یہ تقدیر کے مقابلہ میں میری پہلی کامیابی تھی۔

ملز میں پے در پے کئی اہم واقعات ہو گئے ہیں۔ ملز انتظامیہ کی اشتعال انگیزیوں کے نتیجہ میں مزدوروں نے ایک دن چار پانچ افسروں کی زوردار پٹائی کر دی۔ مگر افسوس جنرل منیجر اس ہنگامے سے بچ نکلے۔

پولیس آئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ آخر پندرہ مزدوروں کے استعفوں پر مفاہمت ہو گئی۔ تمام جھوٹے سچے مقدمات بھی واپس لے لئے گئے۔۔ جس دن پندرہ مزدوروں کے استعفوں کا معاہدہ ہوا میرے چیف نے خاص طور پر فون کر کے میری خیریت دریافت کی۔ مجھے اس بھرپور شکست کا احساس تھا۔ مگر جب مزدوروں کے ہاتھوں افسروں کی زوردار بلکہ چٹخارے دار پٹائی کا خیال آتا تو اس شکست کا احساس زائل ہونے لگتا۔ یوں بھی پٹائی کرنے والے مزدوروں نے تو کوڑے کھانے اور قیدیں بھگتنے کی توقعات کے ساتھ یہ کارنامہ

سرانجام دیا تھا۔ گویا محض استعفے دے کر وہ ستے چھوٹ گئے۔ پھر بھی سبکی کا ایک احساس ضرور موجود رہا۔ میں اور تو سب کچھ بھول سکتا تھا مگر جنرل مینجر کے گھٹیا سلوک کو فراموش کرنا میرے لئے بے حد مشکل تھا۔ اپنی توہین کا انتقام لینے کے لئے میں کسی مقدر سے بھی ٹکرا جانے کے لئے تیار تھا۔

ایک چھٹی کے موقعہ پر ہمارے پورے سٹاف نے ایک بھرپور پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ خاصی دلچسپ پارٹی تھی۔ مگر کوکا کولا کی ایک بوتل کھولتے ہی مجھے احساس ہوا کہ پانی کا وہ قطرہ اس بوتل میں موجود ہے۔ میں نے طنزیہ انداز میں اس قطرے کو دیکھا اور پوری بوتل نہر میں انڈیل دی۔

میرے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ مقدر کے مقابلہ میں میری دوسری کامیابی تھی۔

میرے چیف کی سرگرمیاں میرے خلاف بڑھتی جا رہی تھیں۔ لگتا تھا وہ میرے سارے قرض یکمشت چکا دینا چاہتے ہیں مگر پھر ایک دن انہوں نے زندگی کے سارے قرض بھی چکا دیئے۔ اچانک اطلاع ملی کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ ملز انتظامیہ کا پورا بورڈ کنارے پر موجود تھا مگر کوئی بھی اپنے ڈوبتے ساتھی کی مدد نہ کر سکا۔

اس سانحہ کے کچھ عرصہ بعد چینی کی بلیک مارکیٹنگ کی تحقیق کے دوران کوکا کولا کی انتظامیہ نے حکام کو بتایا کہ انہوں نے چینی ہماری شوگر ملز سے خرید کی تھی۔ چنانچہ ملز پر چھاپہ پڑا اور تحقیقات کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا۔

......

ایک عزیز کی شادی کے سلسلہ میں چند دنوں کے لئے کراچی جانا پڑا تو وہاں ایک دن سمندر کی سیر کا پروگرام بھی بن گیا۔ میں سمندر کی بل کھاتی اور لہراتی ہوئی لہروں کو آتے

جاتے دیکھتا رہا۔ پھر خود بھی سمندر میں اتر آیا لہروں کا مجھے چھو کر دور تک چلے جانا اور پھر شریر انداز میں واپس ہونا مجھے بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں جیسے کھو سا گیا۔ ایسے میں ایک لہراتی ہوئی لہر کو آتے دیکھ کر میں نے اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں وا کیا اور اس لہر کا پانی اپنے منہہ میں بھرنے کے لئے انتظار یہ حالت میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں جیسے نیند سے بیدار ہو گیا۔ اپنے ہونٹوں کے دائرے کی عین سیدھ میں آتی ہوئی لہر میں مجھے وہ قطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لئے اور جونہی وہ قطرہ میرے قریب پہنچا میں نے ایک زوردار ہاتھ مار کر اسے پرے پھینک دیا۔ یہ مقدر کے مقابلہ میں میری تیسری شاندار کامیابی تھی۔

......

ملز انتظامیہ کی زیادتیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ میری تعلیم اور صلاحیتوں کو جانتے ہوئے بھی نہ صرف مجھے مسلسل نظر انداز کر رہی تھی بلکہ اس کا رویہ میرے خلاف خاصا جارحانہ تھا۔ جائز حقوق کی پامالی نے میرے اندر کے باغی کی حوصلہ افزائی کی۔ میں اب مقدر کو بڑی حد تک ڈھونگ سمجھنے لگا تھا۔ لیکن ملز پر پڑنے والے چھاپے کے نتیجہ میں جب جنرل منیجر کے بجائے وہ افسر گرفت میں آیا جس نے ایک دفعہ ایک غریب مزدور کو ناجائز طور پر گرفتار کروا کے نہ صرف پولیس سے پٹوایا تھا بلکہ پھر اسے ملازمت سے بھی نکلوا دیا تھا تو مجھے قدرت کے نظام پر از سر نو غور کرنا پڑا۔

......

پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ قطرہ اس گلاس میں موجود تھا۔ میں نے اس گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ ایک دوسرے گلاس میں پانی منگوایا۔ پھر دوسرے گلاس کو پہلے گلاس سے یوں ٹکرایا جیسے جام سے جام ٹکرائے جاتے ہیں۔ دوسرے گلاس کا پانی پی کر اس پہلے گلاس کو پھر اٹھایا۔ اس قطرے کو ایک فاتحانہ انداز سے دیکھا اور پھر "تقدیر کے نام جام صحت" کہہ کر اس گلاس کو فضا میں اچھال دیا۔ پانی زمین پر گر کر پھیلنے

اور پھر اس میں جذب ہونے لگا۔

تقدیر کے مقابلہ میں یہ میری چوتھی کامیابی تھی۔ مجھے اپنے پاؤں زمین پر ٹکتے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اب ہر استحصالی قوت سے ٹکرا سکتا ہوں۔

ملز میں چینی کی بلیک کے اسکینڈل کی تحقیقات کا کوئی واضح رخ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ تاہم افواہیں گرم ہیں کہ ملز کے مینجنگ ڈائریکٹر، جنرل مینجر اور کچھ افسروں کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے ہیں۔ جبکہ یہ تمام افسران غائب ہیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ اس معاملہ میں کم از کم جنرل مینجر کا انجام ضرور ذلت آمیز ہو۔

میں شہر سے ایک قریبی گاؤں میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تو وہیں گھرے گھرے بادلوں نے آلیا۔ اصولاً مجھے واپسی کی فکر کرنی چاہیے تھی لیکن موسم اتنا خوشگوار اور شاعرانہ تھا کہ میں اس سے بچوں کی طرح لطف اندوز ہونے لگا۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی تو میں نے بارش کے ٹھنڈے اور میٹھے قطرے اپنے منہ میں ڈالنے کے لئے ہونٹ کھولے اور منہ اوپر کیا۔ میری آنکھیں بارش کے باعث جھپک رہی تھیں۔ اچانک میں نے دیکھا وہی قطرہ سیدھا میرے منہ کی طرف آرہا تھا۔ میں نے ہونٹ بند کر لئے اور پھر اس قطرے کو زمین پر گرتا دیکھنے لگا۔ مجھے اس قطرے کی بے بسی پر رحم آنے لگا۔

میں نے تقدیر کو خشکی کے راستے سے بھی شکست دی۔ پانی کے راستے سے بھی شکست دی۔ اور اب آسمان کے راستے سے بھی میں نے اسے شکست دے دی تھی۔

میں اپنی عظمت کو خود ہی حیرت سے دیکھنے لگا!

اتنے دن غائب رہنے کے بعد آج جنرل مینجر ملز میں دیکھے گئے۔ معلوم ہوتا ہے ضمانت کرا کے آئے ہیں۔ لیکن سہ پہر تک اطلاع ملتی ہے کہ پولیس نے جنرل مینجر کی کوٹھی کو گھیرے میں لے کر، اس کی پچھلی کھڑکی کے شیشے توڑ کر، اس راستے سے اندر داخل ہو کر موصوف کو گرفتار کر لیا ہے۔

مجھے عجیب سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

مسرت کی اس عجیب سی کیفیت کے ساتھ میں کین کیریئر کی طرف آتا ہوں۔ یہاں گنے سے لدے ہوئے کتنے ہی ٹرک، ٹرالیاں اور بیل گاڑیاں موجود ہیں۔ میں ایک ٹرالی سے ایک اچھا سا گنا نکال کر، اسے صاف کر کے دانتوں سے چھیلتا ہوں۔ مگر پہلی گنڈیری چوستے ہی مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ قطرہ میرے منہہ میں پہنچ چکا ہے۔ اس کے ذائقے سے آگاہی کی جو خاص قوت مجھے دی گئی تھی وہ اس کی تصدیق کر رہی تھی۔

وہ قطرہ پوری طرح میرے منہہ میں گھل گیا تھا۔ میں نے تھوک کر اس قطرے کو پھینک دینا چاہا۔ لیکن پھر دانستہ طور پر اس قطرے کو حلق سے نیچے اتار لیا۔

اس قطرہ کے میرے اندر جاتے ہی میرے اندر روشنی سی بھر گئی۔ میری انا سے تکبر کی ساری گرد اتر گئی اور پھر میری انا اس روشنی میں ڈوب گئی۔ اس روشنی میں میں نے آنے والے تمام دنوں کو دیکھ لیا۔ اور میرے چہرے پر اطمینان کا نور پھیل گیا۔

تب ہی وہ منجمد لمحہ پگھل گیا جس نے اس کہانی کی ابتدا کی تھی۔

پتھر ہوتے وجود کا دکھ

بکھر گئے ہیں ملن کے تمام دن حیدرؔ
ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں

میں "جادو کے کھیل" کتاب سے ایک کھیل پڑھ کر اس کا عملی تجربہ کرنے کے لئے اباجی کے صندوق سے مشک کافور کی ٹکیاں نکال کر لاتا ہوں۔ تب ہی ہمارے گھر کے قریب والے گھر کی خوبصورت آنکھوں والی بچی آجاتی ہے۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں پانی میں آگ لگا سکتا ہوں۔ وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتی ہے۔ پھر جب میں مشک کافور کی ٹکیوں کو آگ لگا کر پانی میں آگ کا منظر دکھاتا ہوں تو وہ بے حد حیران ہوتی ہے۔ اس کی خوبصورت اور حیران حیران آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوتی ہے۔ اپنی آنکھیں موند کر میں اس چمک کو اپنی روح میں اتارنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔۔ جب آنکھیں کھولتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ پانی میں آگ کے کھیل کی بجائے مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ اس حیرت میں محبت کی مدھم مدھم پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ سحر انگیز پرچھائیاں!

میں ابھی تک اس کے بچپن کے اس سحر سے ہی نہیں نکل پایا۔ مجھے معلوم ہے جونہی میں اس کے بچپن کے سحر سے نکلا اس کی جوانی کا طلسم مجھے پتھر بنادے گا اور تب جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا۔

وہ مختلف موضوعات پر بے تکان بولے جا رہی ہے۔ اور میں اس سے آنکھیں چار کرنے کی بجائے اپنی لائبریری کی بڑی ٹیبل پر نظریں گاڑے اس کی باتیں سن رہا ہوں۔ اور صرف ''ہوں ہاں'' کر کے اپنا اخلاقی فرض پورا کر رہا ہوں۔

گرمیاں آگئی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے چھت پر لگے ہوئے تیز بلب کی روشنی میں روشنی کے ڈھیر سارے کیڑے میری ٹیبل پر گر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے کیڑے کہ ہلکی سی پھونک سے اڑ جائیں، میں ایک کیڑے کو پنسل کے ہلکے سے دباؤ کے ساتھ مسل دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کیڑا مر چکا ہے، مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں مرے ہوئے کیڑے کو بھی متحرک دیکھتا ہوں۔۔ میں نگاہیں جھکائے ہوئے اسے متوجہ کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ یہ کیڑا مرنے کے باوجود حرکت کر رہا ہے۔ وہ تھوڑا غور سے کیڑے کو دیکھتی ہے اور پھر ایک کھنکتا ہوا قہقہہ گونجتا ہے۔

میں اس کی طرف دیکھنے کے لئے سر اٹھاتا ہوں مگر پھر گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ میں اس کے بچپن کے خوبصورت سحر میں ہی گھرا رہنا چاہتا ہوں۔ اس کی جوانی کا طلسم مجھے پتھر بنادے گا۔ اور پھر جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا۔

اس کے کھنکتے قہقہے کی گونج ابھی تک کمرے میں موجود ہے اور پھر اس گونج میں سے اس کی آواز سرسراتی ہے۔ وہ کہتی ہے،

''چھت پر لگے ہوئے پنکھے کی ہوا سے کیڑا متحرک نظر آ رہا ہے۔ وگرنہ کیڑا تو بے چارہ مر چکا ہے۔'' میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں اور پھر اس مردہ کیڑے کو دیکھتا ہوں جو پنکھے کی ہوا سے متحرک نظر آتا ہے۔

وہ پھر کہتی ہے،

''لیکن جن کیڑوں کو تم نے نہیں مسلا وہ بھی مردہ ہی ہیں۔ یہ سارے کیڑے مردہ ہیں۔ صرف پنکھے کی ہوا سے زندہ معلوم پڑتے ہیں۔ یہ بھی جادو کے کھیل ہیں، قسمت کے کھیل ہیں...... ہم جو زندہ ہیں کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟''

وہ میرے بے حد قریب آجاتی ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ وہ کہے جا رہی ہے:

''کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟۔۔ نہیں۔۔ ہم بھی قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں۔ جو صرف ہوا کے دباؤ سے متحرک ہو کر زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

وہ میرے بالکل قریب آکر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتی ہے، میں خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں موند لیتا ہوں۔

وہ کہتی ہے۔

''میری طرف دیکھو! میں بھی ایک مردہ کیڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور تم بھی...... مگر یہ تم نے آنکھیں کیوں موند رکھی ہیں؟''

''تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ہم سب قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں'' (پھر جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا)

اور میں پتھرا جانے کے خوف سے بند آنکھوں پر ہاتھ بھی رکھ لیتا ہوں۔

وہ بڑی ملائمت سے میری آنکھوں سے میرے ہاتھ ہٹاتی ہے اور تب ہی میری اس سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔

اس کی غزالی آنکھوں سے روشنیاں طلوع ہوتی ہیں۔

میں پتھر نہیں ہوتا بلکہ میں تو مسلسل پگھلتا جاتا ہوں۔ خوشبوئیں مجھے گھیر لیتی

ہیں۔ ایک عجیب سی لذت کا احساس جاگتا ہے۔۔ میں بے سبب اس سے خائف رہا۔ میں بھرپور نظروں سے اسے دیکھتا ہوں اور روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور اس کے جسم سے میری روح میں اتر کر رقص کرنے لگتی ہیں

میں اس نئے تجربے کی لذت میں گم ہوں۔

مجھے زندگی کا یقین ہونے لگتا ہے۔

وہ بھی خوش ہے مگر اس کی خوبصورت آنکھوں سے ایک انجانی اداسی جھلک رہی ہے۔ ''ہم مردہ کیڑے نہیں ہیں۔ ہم زندگی کے گواہ ہیں۔ کم از کم تم اور میں''

میری بات سن کر وہ کچھ اور اُداس ہو جاتی ہے۔

شہنائیوں کی دھن سے میرا وجود سن ہوتا جارہا ہے۔

چہرے کے علاوہ مرا باقی جسم پتھر ہو گیا ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جس میں میں نے اپنے اور اس کے بچپن میں پانی میں آگ کا کھیل کھیلا تھا۔ وہ ابھی تک پانی میں آگ کو دیکھنے کے بعد مجھے حیرت سے دیکھ رہی ہے۔

میری بائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جب روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور جسم سے اُتر کر میری روح میں رقص کرنے لگی تھیں۔

اس کی ڈولی روانہ ہونے والی ہے اور میں اپنے کہے لفظوں کی تردید کرتا ہوں:

''اس نے سچ کہا تھا۔ ہم سب مردہ کیڑے ہیں جو قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں متحرک ہونے کے سبب زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

اب مجھے اس کی انجانی اداسی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔

میرا چہرہ بھی پتھر ہونے لگتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میرا سارا چہرہ پتھر ہو جائے اس کے جسم سے میری روح

میں اترنے والی خوشبوئیں میری سانسوں میں جم کر مشک کافور کی کئی ٹکیاں سی بن جاتی ہیں۔ اسکی غزالی آنکھوں سے طلوع ہونے والی روشنیوں سے ان میں آگ لگتی ہے اور پھر میری آنکھوں کے پانی میں آگ تیرنے لگتی ہے۔اور میں اس پانی میں ڈوب کر اور اس آگ میں جل کر خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی آخری کوشش کرنے لگتاہوں تاکہ زندگی کا کچھ تو بھرم رہ جائے!

کاکروچ

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی
زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی

"ایٹمی جنگ کے متوقع خطرات کے پیش نظر میں نے ایٹمی جنگ کے بعد انسان کے حوالے سے ایک کہانی سوچی ہے۔"

نصیر حبیب نے میری بات کو دلچسپی سے سنا اور کہا: "کہانی کا خیال سناؤ"۔ لیکن اسی دوران مسعود شاہ بول اُٹھا: "یار! تم اب تک اسی موضوع پر پہلے ہی دو کہانیاں لکھ چکے ہو۔اس موضوع کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ لگتا ہے ایٹمی جنگ کرا کے ہی رہو گے"۔ مسعود شاہ اپنے مزاج کے لاابالی پن کے باعث جو منہ میں آئے بول دیتا ہے۔

"کہانی کا خیال سناؤ!" نصیر حبیب نے پھر پہلے لہجے میں کہا۔

"چلو یار! اب کہانی سنا بھی چکو" مسعود شاہ نے بے زاری کے ساتھ جیسے نصیر حبیب کا ساتھ دیا۔

"اس کہانی کا آغاز ایٹمی جنگ کے بعد کے انسان سے ہوتا ہے۔ میں اور ایک عورت اس جنگ میں معجزانہ طور پر بچ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مل کر اس زمین پر آدم اور حوا کی نئی کہانی شروع کرتے ہیں۔ میں نہ صرف صاحبِ اولاد ہو گیا ہوں بلکہ میری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہو گئی ہے۔ تاہم کرۂ ارض پر ہماری حالت ایسے ہے جیسے انسان ابھی ابھی غار کے زمانے سے نکل کر جنگل میں جھونپڑے بنا رہا ہے۔ میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں نہیں جانتے کہ انسان کیسی عظیم ترترقیات کے دور سے نکل کر جنگل کے دور میں آ گیا ہے"

میں دیکھتا ہوں کہ نصیر حبیب ہی نہیں مسعود شاہ بھی میری کہانی کو سنجیدگی سے سُن رہا ہے۔

"ایک دن میرے پوتوں، پوتیوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں انہیں عام معمول سے ہٹ کر کوئی انوکھی سی کہانی سناؤں۔ تب میں انہیں اپنے ترقی یافتہ دور کے حالات بتانے لگتا ہوں۔ میرے پیارے بچو! یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ اس کے باوجود کہانی سے زیادہ دلچسپ اور المناک ہے۔ آج سے چند عشرے پہلے ساری دنیا ہم جیسے انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔ انسان کو دنیا میں ہر طرح کی نعمتیں میسر تھیں۔ سفر پر جانا ہو تو کار سے لے کر ہوائی جہاز تک کی سہولتیں موجود تھیں۔"

'دادا ابو! یہ کار اور ہوائی جہاز کیا ہوتے تھے؟'

میری پوتی نے سوال کیا تو مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ کار ایک سواری تھی جس میں چار پانچ آدمی بیٹھ جاتے۔ اسے صرف ہینڈل کرنا ہوتا تھا وہ خود ہی سواریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی۔ یہاں سے دریا کے کنارے تک کا جو فاصلہ ہم آدھے دن میں طے کرتے ہیں۔ کار ہمیں پل بھر میں وہاں پہنچا دیتی تھی۔

بچوں کے چہروں سے تجسس اور دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

'اور دادا ابو! ہوائی جہاز؟'۔ میرے پوتے نے پوچھا

’ہوائی جہاز بہت بڑا ہوتا تھا۔ اس میں کئی سو افراد بیٹھ جاتے تو وہ انہیں اتنی دور تک پہنچا دیتا جتنی دور تم اپنی ساری زندگی میں بھی نہیں جا سکو گے۔ اور ہاں۔ ہوائی جہاز پرندوں کی طرح اڑ کر جاتا تھا۔ دریاؤں اور پہاڑوں کے بھی اوپر سے گزر جاتا تھا۔‘

میری بات سن کر بچے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

’دادا ابو! اور کیا ہوتا تھا آپ کے زمانے میں؟‘ اس بار میرے پوتے کے لہجے میں شرارت کی چمک تھی۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بتانے لگا: اس زمانے میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، فیکس......‘

’دادا ابو! یہ ریڈیو کیا ہوتا تھا؟‘

’یہ ایک چھوٹا سا بکس ہوتا تھا۔ اس کے بٹن گھمانے سے کبھی گیت سنائی دیتے۔ کبھی ساری دنیا کی خبریں، کبھی لوگوں کی گفتگو۔‘

’اور ٹیلی ویژن؟‘

’ریڈیو والی ساری چیزیں ٹیلی ویژن پر سنائی بھی دیتی تھیں اور دکھائی بھی دیتی تھی۔ یعنی اگر کوئی آواز آرہی ہے تو اس کا چہرہ بھی دکھائی دیتا اور وہ شخص ہماری طرح ہی چلتا پھرتا اور بولتا نظر آتا تھا۔‘

ننھے منے معصوم بچوں نے میری بات سن کر اتنے زور سے قہقہے لگائے کہ میں خفیف سا ہو گیا۔ وہ مجھ سے پہلے زمانے کی اور دلچسپ باتیں سننا چاہتے ہیں مگر میں کہتا ہوں۔ پیارے بچو! میں اب تھک گیا ہوں اسلیے باقی باتیں کل سناؤں گا۔

پھر میں اُن کے جھونپڑے سے نکل آتا ہوں۔ جھونپڑے سے باہر آکر یونہی خیال آیا اور میں رُک کر بچوں کی آوازیں سننے لگا۔ میرا ایک پوتا کہہ رہا تھا: ’دادا ابو زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں اسلیے اچھی اچھی کہانیوں کو اپنے زمانے کے واقعات سمجھنے لگ گئے ہیں۔‘

میرے باقی سارے پوتے پوتیاں اس کے تبصرے کی تائید میں ہنس رہے تھے“

میں نے کہانی ختم کی تو مسعود شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "یار! اگر جنگ میں صرف تم اور ایک عورت ہی بچتے ہو تو بچوں کی شادیاں کیسے کیں؟ کیا پھر بہن بھائیوں کی شادیاں کرادیں؟"

"اگر آپ کو اس میں الجھن محسوس ہوتی ہے تو جنگل کے قریب دریا کے کنارے پر ایک اور مرد، عورت بھی جنگ سے بچادیتا ہوں" میں نے وضاحت کی

"یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تو کہانی لکھتے وقت خود اپنی راہ بناتی جائیں گی۔ میں ایک اور اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں" نصیر حبیب نے سنجیدگی سے کہا "ایٹمی جنگ کے بعد سطح زمین پر کسی انسان کا زندہ بچ رہنا سائنسی طور پر ممکن نہیں۔ اسلئے بچ رہنے والوں کو آپ کس بنیاد پر بچارہے ہیں؟"

"میری کہانی بنیادی طور پر فکشن ہے، اسے آپ سائنسی مضمون تو نہ سمجھیں" میں نے نصیر حبیب کے اعتراض کے جواب میں کہا۔

"میں تو فکشن کی اہمیت کا معترف ہوں" نصیر حبیب نے متانت سے کہا "بلکہ میرے نزدیک سائنس کی بنیاد بھی فکشن پر ہے۔ ہر نیا سائنسی انکشاف پہلے فکشن ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے جو نکتہ اٹھایا ہے پہلے مجھے اس کی تفصیل بیان کر لینے دیں۔"

میں تو نصیر حبیب کی تفصیل سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا ہی۔ مسعود شاہ بھی خلاف توقع سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"سطح زمین پر ایٹمی جنگ کی صورت میں کوئی ذی روح مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔ صرف وہ مخلوق زندہ رہ سکتی ہے جس میں NUCLEAR POISON ہو۔ کیونکہ صرف یہی ELEMENT ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے۔ مثلاً LEAD ہر قسم کی تابکاری کو جذب کر سکتا ہے لیکن اگر انسانی خون میں LEAD شامل ہو تو پھر اسے ہلاک کرنے کے لئے ایٹمی جنگ کی بھی ضرورت نہیں، انسان ویسے ہی مر جائے گا"

"آپ کا مقصد یہ ہے چونکہ انسانی خون شریانوں میں ہوتا ہے اس لیے اس کی

موت واقع ہو جائے گی لیکن بعض ذی روح ایسے ہیں کہ ان کے ہاں شریانوں والا سسٹم نہیں ہے مثلاً مکھی کے جسم میں خون کی الگ تھیلی ہوتی ہے، اسلئے اگر اس کے جسم میں NUCLEAR POISON ہو تو اس کی موت واقع نہیں ہو گی"

میری بات سن کر نصیر حبیب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "آپ کی کہانی اب بنے گی۔ مکھی کی جگہ کاکروچ لے لیں۔ فرض کر لیں کہ کاکروچ کے وجود میں بھی ایسا سسٹم ہے کہ تابکاری اثرات اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ الٹا اس کی GROWTH کرتے ہیں۔ لہٰذا ایٹمی جنگ کے بعد سارے ذی روح مر جائیں گے سوائے کاکروچ کے۔ اور تابکاری اثرات سے جب ان کی GROWTH ہو گی تو آنے والے زمانے میں اس زمین کے حکمران اور مالک یہی کاکروچ ہوں گے جو انسانی قد کے برابر ہو جائیں گے"۔ نصیر حبیب کی کہانی سن کر مسعود شاہ نے زردار قہقہہ لگایا۔

"ٹھہریں!" میں نے ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے کہا "کہانی تو ہزاروں سال پہلے بن چکی ہے" نصیر حبیب نے مجھے الجھے ہوئے انداز سے دیکھا۔

"دوستو! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم آج کے انسان ہزاروں سال پہلے کے کسی زمانے کے کاکروچ ہوں"

"کیا؟" نصیر حبیب اور مسعود شاہ کی آوازوں میں گھبراہٹ تھی اور پھر وہ اس طرح اپنے آپ کو دیکھنے لگے جیسے واقعی کسی پرانے زمانے کے کاکروچ ہوں۔

روشن نقطہ

طور سے بڑھ کے اپنا حال ہوا
صرف اک بار من میں جھانکے تھے

"میں محبت کیا ہارا، دین اور دُنیا بھی ہار گیا" پیر سائیں نے میری بات سن کر مجھے غور سے دیکھا:

"محبت میں ہار جیت کوئی معنی نہیں رکھتی" پیر سائیں کی آواز میں تھر تھراہٹ تھی "لیکن پہلے اپنا قصہ سناؤ"

"وہ مجھے چاہتی ہے۔ بس میں اسے چاہتا ہوں مگر وہ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہے اور جان بوجھ کر بھٹکتی پھر رہی ہے"

"مجھے وہ خاصی ذہین لگتی ہے۔ جان بوجھ کر بھٹکنے والے لوگ غیر معمولی ہوتے ہیں" پیر سائیں بھی شاید اس کے چاہنے والے نکلے۔

''محبت کی شدت کے باوجود اس نے آج تک حجاب قائم رکھا ہے''میں نے اذیت کے ساتھ کہا۔

''المحبة حجاب بين المحب والمحبوب۔ محبت خود محبوب اور محب کے درمیان پردے کا نام ہے''پیر سائیں نے آنکھیں موند کر عالم استغراق سے کہا۔

''اگر محبت خود پردہ ہے تو پھر یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے؟''میں نے پیر سائیں سے سوال کیا۔

''پردہ ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے۔ اگر یکتائی کے سفر راست طور پر کئے جائیں تو سارے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔''

''پیر سائیں! مجھے وہ سفر بتائیں۔ میں پھر سے اپنا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا چاہتا ہوں''میں نے ادب کے ساتھ درخواست کی۔

پیر سائیں نے گہری سانس لی اور بولے:

''محبت کے چار سفر ہیں۔ کامیابی کے لئے یہ سفر ضروری ہیں

محب سے محبوب کی طرف۔ محبوب سے محب کی طرف

محب سے محب کی طرف۔ محبوب سے محبوب کی طرف''

''پیر سائیں! کیا ان اسفار کے بعد گوہر مقصود مل جاتا ہے؟''میں نے خوشی کے ساتھ سوال کیا۔

پیر سائیں نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے پھر ادب کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔ پیر سائیں نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ میں نے نظر اُٹھا کر پیر سائیں کی طرف دیکھا۔ ان کا گلا رندھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور شدتِ غم سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پیر سائیں بھی محبت ہارے ہوئے تھے۔

''اللہ اکبر''پیر سائیں کے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے ایک فقیر نے نعرہ لگایا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پیر سائیں نے بھی اسے حیرت سے اس طرح دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ

رہے ہوں۔ اب وہ اپنی غم کی حالت پر بھی قابو پا چکے تھے۔

"پیر سائیں! آپ تو شاید صرف محبت ہارے ہوئے ہیں مگر میں تو دین و دُنیا بھی ہار چکا ہوں"

"دین کو سمجھنے کے لئے دنیا کو سمجھنا ضروری ہے۔ تمام عوالمِ الٰہی کو سمجھ کر ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔"

"مگر مجھے تو کسی نتیجے کا انتظار نہیں۔ میں تو اپنی بازی ہار چکا ہوں" میں نے مایوسی سے کہا۔

"محبت کے اسفار کی طرح عوالمِ الٰہی کو بھی چار حصّوں میں بیان کیا جا سکتا ہے" پیر سائیں نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا

"یوں تو عوالمِ الٰہی لامتناہی ہیں مگر اپنی سہولت کے لئے ہم نے انہیں چار حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے"

"پیر سائیں۔ میں اپنی دنیا ہارنے کی بات کر رہا ہوں، آپ کون و مکان کی باتیں فرما رہے ہیں" میں نے پھر پیر سائیں کو اپنے مسئلے کی طرف لانے کی کوشش کی۔ مگر بے سود!

"پہلا عالم، عالمِ زمان ہے۔ یہ ایسا عالم ہے جس کی اِبتدا اور اِنتہا دونوں ہیں۔

دوسرا عالم، عالمِ دہر ہے۔ اس عالم کی ابتدا معلوم مگر اِنتہا نا معلوم ہے۔

تیسرا عالم، عالمِ سرمد ہے۔ اس کی ابتدا بالکل نظر نہیں آتی مگر انتہا سمجھ میں آتی ہے۔

چوتھا عالم، عالمِ ازل ہے۔ اس کی نہ ابتدا کا پتہ ہے نہ اِنتہا کی خبر ہے" پیر سائیں چاروں عوالم بیان کر کے تھوڑا سا رُکے اور پھر بولے:

"اب بتاؤ تم کونسی دُنیا ہارے ہو؟"

مجھے پیر سائیں کی پہلی بات کی سمجھ آ گئی۔ "دین کو سمجھنے کے لئے دنیا کو سمجھنا

ضروری ہے" واقعی ان دنیاؤں میں تو سب کچھ ہی آگیا ہے اور میں اپنا آپ ہار چکا ہوں۔

"حضرت! کیا یہ وہی چار عوالم ہیں جنہیں لاہوت، جبروت، ملکوت اور ناسوت بھی کہا جاتا ہے؟"

"ہاں۔ یہ وہی دنیائیں ہیں۔ محبت کے چاروں اسفار ہوں یا عوالمِ الٰہی کے اسفار ہوں۔ طے ہونے پر آئیں تو ایک ہی جست میں طے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ سفر شروع کرنے سے پہلے طے ہو جاتے ہیں۔ اور طے نہ ہوں تو آدمی ساری زندگی چکراتا پھرے۔ بھول بھلیاں میں ہی رہے گا۔"

میں نے پیر سائیں کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہاں گہرے کرب کے آثار نمایاں تھے۔ لاحاصلی کا دکھ اپنے آپ ظاہر ہو رہا تھا۔ مجھے پیر سائیں بھی بھول بھلیاں میں چکراتے نظر آئے۔

"اللہ اکبر" مجذوب فقیر نے پھر نعرہ لگایا اور مجھے محسوس ہوا کہ پیر سائیں اس بار گھبرا گئے ہیں۔

"پیر سائیں! اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟" مجھے بھی مجذوب فقیر سے کچھ خوف محسوس ہونے لگا۔

"توحید خداوندی پہ کامل ایمان" پیر سائیں نے مجذوب فقیر کو دیکھ کر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"تو پھر مجھے توحید کا بھید سمجھا دیں"

"توحید کا بھید!" پیر سائیں کی آواز لرزی "تم نے سنا نہیں۔ جو توحید کے بارے میں سوال کرتا ہے وہ جاہل ہے۔ اور جو کوئی جواب دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ مشرک ہوتا ہے کیونکہ "بے مثال" کے بارے میں بتانے کے لئے اسے کسی مثال کا سہارا لینا پڑے گا" پیر سائیں کی لرزتی آواز اب جوش سے بھرنے لگی تھی۔ "۔ اور جو توحید کی معرفت کا دعوٰی کرے وہ ملحد ہے کیونکہ خدا لامحدود ہے اس لئے اس کا عرفان کبھی مکمل ہو

ہی نہیں سکتا اور۔ جو توحید کو نہ سمجھے وہ کافر ہے" پیر سائیں کے بیان سے میں جھومنے لگا۔
مجذوب فقیر نے بھی الا اللہ۔ الا اللہ کی صدائیں بلند کیں۔

"سائیں پھر تو ساری بات ایک الف پر ہی تمام ہوتی ہے" مجھے بلھے شاہ یاد آ گئے۔

"تم نے الف سے آگے کا سبق نہیں پڑھا۔ الف بھی زیادہ ہے"

اس دفعہ پیر سائیں کی بجائے مجذوب فقیر بولا اور مجھے یوں لگا جیسے بھونچال سا آگیا ہے۔ پیر سائیں بھی اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"علم ایک نقطہ ہے جسے جاہلوں نے بڑھادیا ہے" مجذوب فقیر اپنی لے میں بولا "الف تو بہت زیادہ ہے۔ بات ایک نقطے میں تمام ہو چکی ہے۔"

پیر سائیں۔ مجذوب فقیر کی بات سن کر تڑپے اور بے ہوش ہو گئے۔

دور کہیں سے بلھے شاہ کی کافی گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اک نقطے وچ گل مکدی اے......

پیر سائیں اور مجذوب دونوں ایک نقطے میں ڈھل گئے تھے۔

اس نقطے سے عجیب سکون بخش روشنی پھوٹ رہی تھی۔

اور یہ روشنی میرے دل سے پھوٹ رہی تھی!

دو کہانیوں کی ایک کہانی

مشینوں کے اس عہدِ نارِ دا کا میں ہی یوسف ہوں
مجھے اس نوکری کی شکل میں نیلام ہونا تھا

بچپن میں جب میں نے پہلی بار الٰہ دین کے چراغ والے جن کی کہانی سنی تھی تو جن کا نام سن کر ڈر جانے کے باوجود مجھے کہانی اچھی لگی تھی۔ آج کارخانے کی چمنی سے اٹھتے ہوئے گہرے سیاہ دھویں کو دیکھ کر میں نے سوچا ہے کہ ابھی اس میں سے ایک جن نمودار ہوگا اور میرے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر درخواست کرے گا۔ "کیا حکم ہے میرے آقا؟"۔ اور پھر میرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ میرے چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ لیکن جن کی بجائے سامنے سے کارخانے کا سخت دل اور کرخت زبان مالک آجاتا ہے۔ میں خوفزدہ ہو کر وہاں سے ہٹ جاتا ہوں۔

☯

شاہ جی سے ایک دفعہ "منطق الطیر" کے مسئلے پر بات ہوئی تو انہوں نے ٹل اور

بُلبُل کی ایک دن کی زندگی کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا پورا احوال سناڈالا۔ بعض جانوروں سے لے کر درختوں اور پودوں تک سے اپنی بات چیت کی کہانیاں سنادیں۔ میں شاہ جی کا بہت احترم کرتا ہوں اس لئے اُن کی باتوں کا یقین نہ کرنے کے باوجود چپ ہو رہا۔ شاہ جی میری خاموشی کو بھانپ گئے۔ اسی لمحے روشنی کا چھناکا سا ہوا اور عجیب سانور چاروں طرف بکھر گیا۔ میں نے دیکھا شاہ جی کی کلائی پر ایک مچھر آن بیٹھا ہے لیکن یہ مچھر محض مچھر نہیں تھا۔ وہ واضح طور پر ایک بوڑھا ڈاکٹر لگ رہا تھا جس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں سرنج لئے وہ شاہ جی کو انجکشن لگانے کے لئے ذرا سا جھکا۔

"جناب والا! کیوں مجھ غریب کے درپے ہیں؟ شاہ جی نے بڑی ملائمت کے ساتھ مچھر سے کہا۔

"یہ میری ڈیوٹی ہے جناب" مچھر نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن جناب! میں زیادتی خون کا مریض نہیں ہوں" شاہ جی نے کہا۔

"میں نے ایک قطرہ کا پتہ نہیں کتنا حصہ خون لینا ہے۔ کیا فرق پڑے گا اس سے...... " مچھر نے کسی شفیق ڈاکٹر کی طرح مسکراتے ہوئے کہا، اپنی عینک کو ماتھے پر چڑھایا اور پھر کلائی کی طرف جھکتے ہوئے بولا "اور ہاں...... یہ بھی ذہن میں رکھیۓ کہ معمولی سا خون لینے کے عوض میں ایک ایسا مادہ بھی خارج کرتا ہوں جو آپ کے اندر فالج کے حملے کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرتا ہے" اتنا کہہ کر مچھر نے شاہ جی کو انجکشن لگادیا۔ شاہ جی صرف مسکرا کر رہ گئے۔ میں کسی معمول کی طرح کھویا کھویا سا اپنے آپ میں واپس آگیا۔

☯

کارخانے کی چمنی سے نکلتے ہوئے دھویں کی سیاہی دیکھ کر سوچتا ہوں اس میں میرا لہو شامل ہے تو پھر دھواں اتنا سیاہ کیوں ہے؟ جن کا خون سفید ہو چکا ہے وہ میری سلامتی کے علمبردار ہیں۔ چمنی سے نکلتا ہوا گہرا سیاہ دھواں ان کی طرف سے میری حمایت میں سوگ کی

علامت ہے۔ لیکن میرے سفید و سیاہ پر سارا اختیار انہیں کو حاصل ہے۔ الہ دین کا چراغ میرے ہاتھ میں ہے لیکن اب اس کی روایت بدل چکی ہے۔ اب جن کے احکامات کی بجا آوری الہ دین کا فرض ہے۔

چمنی سے اٹھتے سیاہ دھویں کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ شاید چراغ کا جن ابھی حاضر ہونے والا ہے۔ میں اس کے احکامات کی تعمیل کے لئے پہلے ہی مؤدب ہو کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

☯

''منطق الطیر'' والے تجربے کے بعد سے میں شاہ جی کا بہت زیادہ معتقد ہو گیا ہوں لیکن آج شاہ جی نے ایک پیر جی کا احوال سنا کر حیران کر دیا۔ شاہ جی اُن پیر جی سے بے حد متاثر نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے:

''میں نے پیر جی سے پوچھا یہ آپ نے اتنا بڑا مزار کیوں بنا رکھا ہے؟

میری بات سن کر مسکرائے اور بولے ''یہ تو صرف لوگوں کو جمع کرنے کا بہانہ ہے کیونکہ من حیث القوم ہم مردہ پرست ہیں۔ زندوں کو مار ڈالتے ہیں اور مرے ہوؤں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ بس اسی وجہ سے مزار بنوانا پڑا۔''

میں پیر جی کی صاف گوئی سے بڑا متاثر ہوا۔ پھر اُن کے علم کا اندازہ لگانے کے لئے اُن سے الم کے معنی پوچھے۔ انہوں نے مجھے ششدر کر دیا۔

''یہ نفس کی تین حالتوں کا بیان ہے۔ امارہ۔ لوامہ۔ مطمئنہ''

پیر جی نے علم و معرفت کی اتنی بڑی بات ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر دی۔ میں تب سے اب تک اسی عارفانہ سرور میں بھیگا ہوا ہوں''

شاہ جی کی پیر جی سے ملاقات کی روداد نے مجھے بھی مسحور کر دیا۔

☯

کارخانے کی رہائشی کالونی میں میرے کوارٹر سے ملحقہ کوارٹر کی ایک زلیخا نے مجھے

ایک عرصے سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ میں نہ یوسف ہوں نہ پیغمبر۔ جبکہ زلیخا کے مقابلے کے لئے حسنِ یوسف اور شانِ پیغمبری دونوں کو یک جا کر دیا جاتا ہے۔ میں ان دونوں خوبیوں سے محروم ،زلیخا کے سامنے کھڑا کانپ رہا ہوں۔ آخر میں گنہگار کیوں اس کڑی آزمائش میں ڈال دیا گیا ہوں۔ میں شیطان سے لڑتا رہا۔ ساری رات مقابلہ ہوتا رہا۔ میں ہانپنے لگا جبکہ شیطان اسی طرح تازہ دم تھا۔ آخر میں کوارٹر سے بھاگ نکلا۔ کارخانے پہنچا تو وہاں کارخانے کے مالک کی شکل میں شیطان پھر میرا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی اور وہ بالکل تازہ دم تھا جبکہ میں نڈھال ہو چکا تھا۔

☯

میں نے اپنا سارا دکھ شاہ جی کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ ان کی آنکھوں میں ایک ملکوتی چمک پیدا ہوئی:

”شیطان ہمارے اندر بھی ہوتا ہے اور باہر بھی۔ جنّوں میں بھی، انسانوں میں بھی اور ان سے سوا بھی۔ شیطان کے لاکھوں روپ اور کروڑوں حربے ہیں۔ ہم عاجز انسان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ شاہ جی ذرا دم لینے کو رُکے اور پھر گویا ہوئے ”ہم شیطان کو مار نہیں سکتے اسلئے کبھی بھی شیطان کے ساتھ نہیں لڑنا۔“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یا الٰہی! یہ شاہ جی کیا کہہ رہے ہیں؟۔ میں نے پریشانی کے عالم میں سر اٹھا کر شاہ جی کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی ملکوتی چمک تھی۔

”ہاں۔ ہم شیطان کو ہلاک نہیں کر سکتے اس لئے کبھی بھی شیطان کے ساتھ نہیں لڑنا۔ بس جتنا ہو سکے اس نامراد سے بچ کر رہو اور اِس سے دور بھاگو۔ اس سے دور بھاگنے ہی میں عافیت ہے اور یہی تقویٰ ہے“

شاہ جی کی بات میری سمجھ میں آگئی۔

☯

آج شاہ جی سے پورے سات دن بعد ملاقات ہوئی۔ وہ کچھ بجھے بجھے سے تھے۔

میرے استفسار پر انہوں نے بتایا:

"میں پھر پیر جی کے ہاں گیا تھا"

"اچھا!" میں نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"پیر جی کہنے لگے میں خدا سے براہ راست گفتگو کر اسکتا ہوں"

"خدا سے براہِ راست گفتگو۔ مکالمہ الٰہیہ۔" خوشی سے میری آواز لرزنے لگی۔

"میرے لئے بھی یہ بڑی پُرکشش بات تھی" شاہ جی بھرائی ہوئی آواز میں بولے

"پھر۔؟"

"پیر جی کی شرط ہے کہ خدا سے بات کروانے کے عوض انہیں ایک سجدہ کیا جائے"

"خدا سے بات کرانے کے عوض پیر جی کو سجدہ!" میرا دل بیٹھنے لگا "پھر آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے پیر جی سے کہا کہ جناب سر تو ایک ہی ہے اور یہ جسے دینا تھا دے چکا ہوں۔ اگر دوسرا سر ہوتا تو ضرور سجدہ کرتا" شاہ جی کی بھرائی ہوئی آواز پرجوش ہو گئی "پیر جی سے اتنا کہہ کر میں واپس آگیا۔"

"شاہ جی! اب میری کہانی بھی سُن لیں" میں نے پھیکی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کہا۔

شاہ جی نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں "سناؤ تمہاری کہانی کیا ہے؟"

"شاہ جی! آپ نے کہا تھا نا کہ شیطان جِنّوں میں بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں بھی اور یہ کہ ہم شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سو کارخانے کے مالک اور کالونی کی زلیخا۔ میں دونوں میں سے کسی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور ان دونوں سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی، میں کارخانے کی نوکری چھوڑ دوں۔ اور شاہ جی! میں نے نوکری چھوڑ دی ہے"

"تو تم نے نوکری چھوڑ دی؟" شاہ جی نے بے حد دکھی لہجے میں پوچھا۔

مجھے یوں لگا جیسے شاہ جی نوکری اور کوارٹر چھوڑ کر آئے ہیں اور میں پیر جی کو جواب دے کر آیا ہوں۔ اور ہم دونوں شیطان سے لڑ کر نہیں بھاگ کر آئے ہیں۔

گھٹن کا احساس

ہم نے بھوگا ہے صرف اسے حیدرؔ
ہم نے کب زندگی گزاری ہے

بچپن میں اُس کی ماں اُسے نلکے کے نیچے بٹھا کر نہلایا کرتی تھی۔ اس کا بھائی نلکے کی ہتھی چلاتا، ماں اُس کے پورے جسم پر صابن مَل کر اسے اچھی طرح سے صاف کرتی۔ ماں کا نہلانا اُسے اچھا لگتا تھا لیکن جب وہ اس کے منہہ پر صابن لگاتی اور اُسے آنکھوں میں اُس کی چبھن محسوس ہوتی تب وہ تکلیف کے باعث اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا۔ صابن سے بھی زیادہ گھبراہٹ اُسے اُس وقت ہوتی جب اس کا سر نلکے کے پھن کے عین نیچے ہوتا۔ پانی سیدھا اس کے سر اور چہرے پر امنڈتا چلا آتا اُسے ایسا لگتا جیسے وہ کسی گہرے پانی میں ڈوب رہا ہو۔ وہ گھبراہٹ کے مارے چیخنے لگتا۔ ایسے موقعہ پر اس کا بھائی شرارت سے نلکے کی ہتھی کو زیادہ تیزی سے چلانے لگتا۔ اُس کی گھبراہٹ تڑپنے جیسی حالت میں بدل جاتی۔ تب ماں اسے سینے سے لگالیتی۔ ماں کے سینے سے لگتے ہی اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو جاتی۔

لڑکپن میں ایک بار اُسے اپنے باپ کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا موقعہ ملا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا تو خوفزدہ ہو گیا۔ وہ بلندی اور پانی دونوں سے ڈرنے لگا۔ اسے زمین سے جڑے رہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا بلندی اور پانی سے اس کا خوف بڑھتا گیا۔ ایک بار وہ ایک بائیس منزلہ عمارت کی آخری منزل پر گیا۔ بائیسویں منزل کے ایک فلیٹ کی بالکونی سے جب اس نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اسے لگا وہ ابھی نیچے گر پڑے گا۔ اس نے بالکونی سے پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ جڑ کر آہستہ آہستہ کمرے کی طرف سرکنا شروع کیا اور جب وہ تین میٹر کا فاصلہ طے کر کے بالکونی کے ساتھ ملحقہ کمرے میں گیا تو اس کا سانس ایسے پھولا ہوا تھا جیسے وہ 300 میٹر کی دوڑ کے آخری پوائنٹ پر پہنچا ہو۔

جوانی میں ملازمت کے باعث اسے کئی گھر تبدیل کرنے پڑے۔ اسے اتفاق کہیں کہ ہر گھر کا باتھ روم بے حد مختصر ہوتا۔ نہانے والا سمٹ سمٹا کر شاور کے نیچے کھڑا ہو سکتا تھا۔ کئی بار اس نے سوچا اس سے تو بچپن کا وہ نلکا اور کھرا بہتر تھا۔ وہاں اتنی شدید گھٹن تو نہیں تھی۔ تنگ باتھ روم میں جا کر کبھی کبھی اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی ملنگ ہے جو کسی شہزادی پر فریفتہ ہو گیا ہے اور بادشاہ نے اسے سزا کے طور پر دیواروں میں زندہ چن دینے کا حکم دے دیا ہے۔ تب وہ نہائے بغیر ہی گھبرا کر باہر نکل آتا۔ نہاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی پوری کمر پر نہیں پھر سکتا تھا۔ ماں کا کمر پر صابن ملنا یاد آتا تو اس کا جی چاہتا کاش ماں زندہ ہوتی اور اب بھی میری کمر پر صابن مَل دیتی۔ ایسے ہی خیالوں کے دوران ایک بار اُس نے اپنی بیوی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اس کی بیوی نہ صرف اس کی ماں کی بھتیجی تھی بلکہ بڑی حد تک اس کی ماں کی ہم شکل بھی تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نہاتے وقت اس کی کمر پر صابن مَل دیا کرے۔ اس کی بیوی تھوڑا سا شرمائی پھر کہنے لگی: ”مجھ سے یہ فلموں والے باتھ روم کے سین نہیں ہو سکتے“ وہ بیوی کے جملے پر مسکرایا اور پھر اس نے سوچا یہ پگلی کہاں جا پہنچی۔ یوں بھی باتھ روم میں اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ وہ بھی میرے

ساتھ سماسکتی۔

ایک دن اُس نے اخبار میں خبر پڑھی: ایک عورت جسے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا گیا تھا دو دِن کی مشقت کے بعد اپنی قبر اُدھیڑ کر باہر نکل آئی۔ یہ خبر پڑھ کر اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ کسی زندہ انسان کو مردہ سمجھ کر دفن کر دینا۔ لیکن قبر کے اندر لیٹا ہوا انسان کیسے اُسے اُدھیڑ سکتا ہے؟ اس نے خوف اور حیرت سے سوچا۔ پھر اُس نے فرض کیا کہ اُسے بھی اسی طرح مردہ سمجھ کر دفن کر دیا جائے تو وہ اپنی قبر اُدھیڑ سکے گا یا نہیں۔ وہ تو سچ مچ وہیں دَم گھٹ کر مر جائے گا۔ اور پھر گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ رات کو جب سردی کے باعث اس نے کمبل اپنے منہ پر لیا، اسے ایسے لگا جیسے وہ کفن میں لپٹا ہوا قبر میں پڑا ہے۔ اس نے گھبرا کر کمبل کو چہرے سے ہی نہیں سینے سے بھی اُتار پھینکا اور بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بعد میں اُس نے اپنے ایک دوست کو اپنی گھبراہٹ اور گھٹن کے احساس کے بارے میں بتایا تو اس نے اسے مشورہ دیا کہ تیراکی سیکھ لو۔ اب وہ اپنے دوست کو کیا بتاتا کہ وہ تو بچپن سے نلکے کے پانی سے بھی خائف ہے۔ تیراکی کیسے سیکھ لے! سو اس نے دوست کے مشورے کو مذاق کے رنگ میں ٹال دیا ”کیا پتہ کل کلاں مجھے مہینوال کا کردار کرنا پڑ جائے پھر دریا میں ڈوبنے کی بجائے تیر کر پار لگ جاؤں گا اور محبت کی رسوائی ہو جائے گی“

اس عرصہ میں اوزون کا مسئلہ، آلودگی کا مسئلہ اور ایٹمی جنگ کا امکانی خطرہ۔ ان موضوعات پر اس کا مطالعہ بڑھتا گیا۔ وہ سوچتا: انسان نے مختلف نظریات اور مزعومہ برتری کی لڑائیوں میں نفرت کی آلودگی بڑھائی، بلندیوں کی آرزو میں اوزون میں شگاف ڈال دیے، صنعتی ترقی اور اسلحے کی دوڑ میں ماں جیسے مقدس پانی کو ناپاک کر دیا، جنگلوں کو اُجاڑ دیا، اتنے ہولناک نیوکلیائی ہتھیار بنا لئے کہ دھرتی کا دم گھٹ کر رہ جائے۔ یہ ساری بلندیاں انسانیت کو قبر میں گرانے والی ہیں۔ جیتے جی قبر میں گرانے والی۔ اور پھر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس پر شدید گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔ ایسے ہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ ایک بار ٹرین کا سفر کر رہا تھا۔ جب سوچتے سوچتے اس کا دم گھٹنے لگا وہ اٹھ کر ٹرین کے دروازے کے قریب آیا۔ دروازہ کھلا ہوا

تھا۔ اس نے گیٹ کے دائیں بائیں نصب شدہ دونوں ڈنڈوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اندر آتی ہوئی تیز ہوا سے گھٹن کا احساس کم ہونے لگا۔ اسے قدرے سکون مل رہا تھا لیکن پھر یکایک اس کے ذہن میں عجیب سا خیال آیا۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دو۔ پھر یوں لگا جیسے یہ خیال نہیں کوئی غیبی آواز ہے جو اسے حکم دے رہی ہے: چھلانگ لگا دو۔ وہ گھبرا کر اپنی سیٹ کی طرف لوٹ آیا۔ اگر وہ مزید تھوڑی دیر گیٹ پر کھڑا رہتا تو یقیناً چھلانگ لگا دیتا۔ اس واقعہ کے بعد وہ کسی بھی بلندی والی جگہ جاتا، اسے یہی آواز سنائی دینے لگتی: نیچے چھلانگ لگا دو۔ چھلانگ لگا دو۔ اور وہ گھبرا کر نیچے آ جاتا۔

اس دن وہ صوبائی دارالحکومت سے واپس آ رہا تھا۔ رستے میں ماں، باپ کی قبروں پر جانے کی آرزو ہوئی اس لئے ان کے شہر کی طرف چل پڑا۔ وہاں ان دنوں رستے میں دریا کا پُل زیرِ مرمت تھا۔ کام کی وجہ سے ساری رات پُل پر آمد و رفت معطل رہتی تھی۔ اسے اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن اب دریا کے اِس طرف آ گیا تھا تو دوسری طرف جا کر ماں، باپ کی قبروں پر دعا کئے بغیر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے وہ دریا کے اِس طرف مزے سے رات بسر کر سکتا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ صبح رستہ کھلتے ہی دریا کے پار چلا جائے گا۔ لیکن رات دس بجے کے قریب ایک شخص اس کے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ دریا کے دوسری طرف والے شہر کا باسی ہے اور ایک چھوٹے سے پُل سے واقف ہے جہاں سے پیدل دریا پار کیا جا سکتا ہے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔ یہ بمشکل دو فٹ چوڑا پُل تھا جس کے ایک طرف لوہے کے پائپوں کا جنگلہ سا بنا تھا اور دوسری طرف سے بغیر جنگلے کے تھا۔ اس نے آدھا پُل بے خیالی میں پار کر لیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو پُل صراط پر چل رہا ہے۔ اس نے جنگلے کو پکڑے ہوئے اوپر دیکھا۔ ریلوے لائن والے پُل پر چندھیا دینے والی روشنی تھی۔ وہاں مزدور کام کر رہے تھے۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نیچے نظر دوڑائی تو گرمیوں کا چڑھتا ہوا دریا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ تب اسے جتنی دعائیں یاد تھیں اس نے ان کا ورد شروع کر دیا ان میں علم میں اضافے سے لے کر والدین کی

مغفرت تک کی کئی غیر متعلق دعائیں بھی شامل تھیں۔ نہ وہ اوپر دیکھ سکتا تھا نہ نیچے۔ تب اس نے اپنے آگے والے ہم سفر کو دیکھا تو وہ غائب تھا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کون تھا اور کیوں مجھے یہاں تک لا کر غائب ہو گیا۔ دریا کے دوسری طرف والے شہر کے رہنے والے نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟ ان خیالوں اور سوالوں کے ساتھ اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ ایک طرف گہری تاریکی تھی اور ایک طرف ٹرین کے پُل پر ہونے والی تیز روشنی۔ گھبراہٹ میں اس کا ایک ہاتھ جنگلے سے ہٹ گیا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں دریا کا چڑھتا ہوا پانی تھا، اضطراری طور پر اس کا دوسرا ہاتھ بھی جنگلے سے ہٹ گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ پھر اسے وہی آواز سنائی دینے لگی: چھلانگ لگادو...... نیچے چھلانگ لگادو۔ پھر دریا میں گہری چھپاک کی آواز اس نے خود ہی سنی تھی۔ اس کے بعد اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں اسے نہلا رہی ہے۔ اس نے اس کے منہ پر صابن مل دیا ہے۔ بھائی نے نلکے کی ہتھی تیز چلانی شروع کر دی ہے۔ گھبرا کر وہ تھوڑا سا تڑپا تو ماں نے بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگالیا۔ اس کی ساری گھبراہٹ دور ہو گئی۔

بھولے کی پریشانی

ہماری بے خبری بھی بجا سہی حیدرؔ
پر اس کی برہمی بھی تو کسی سبب سے ہے

خدا کی قسم۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ میں چوہدری اللہ دتہ صاحب کے گھر اُس وقت سے نوکر ہوں جب میری عمر بمشکل سات سال کی تھی۔ تب میرے غریب ماں باپ کے لئے مہینے کے بیس روپے بڑی دولت تھے جو میری تنخواہ کے طور پر انہیں ملتے تھے اور میرے لئے چوہدری صاحب کے گھر کا مزیدار کھانا، جو میں جی بھر کے کھا سکتا تھا بہت بڑی نعمت تھی۔ آج جب مجھے اس گھر کی خدمت کرتے اور اس کا نمک کھاتے اٹھارہ سال ہو گئے ہیں میں نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھ پر تو چوہدری صاحب اور اللہ بخشے چوہدرانی جی کو ہمیشہ بھروسہ رہا۔ جوان ہو جانے کے بعد بھی میں نے اس خاندان کی کسی لڑکی کو کبھی میلی نظروں سے نہیں دیکھا۔ نہ کبھی رقم کا کوئی ہیر پھیر کیا۔ پھر آج مجھ پر نمک حرامی کا الزام کیوں لگایا گیا ہے؟

اللہ بخشے چوہدرانی جی بڑے پیار سے کہا کرتی تھیں کہ بھولے تو سچ مچ بھولا ہے۔ پر ایمانداری کی بات ہے میں اتنا بھولا بھی نہیں ہوں یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات سب کچھ اچھی طرح جانتے ہوئے بھی بھولا بن جاتا ہوں۔ نمک حلالی کے لئے بھولپن بہت ضروری ہے۔ میں نے چوہدری اللہ دتہ صاحب کے گھر میں بہت کچھ دیکھا ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھا بھی ہے اس کے باوجود مجال ہے میں نے کسی بات کی بھنک باہر پڑنے دی ہو۔ میں نے تو ہمیشہ پردہ پوشی کی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں پندرہ برس کا تھا۔ گھر پر چوہدری صاحب کی دونوں چھوٹی بیٹیاں رفیعہ بی بی اور ماجدہ بی بی ہوتی تھیں۔ باقی لوگ امریکہ گئے ہوئے تھے۔ تب ماجدہ بی بی اپنے کمرے کی بجائے بیٹھک میں سوتی تھیں۔ ہر رات دس بجے کے قریب ایک خاص طرز کی ہلکی سی دستک ہوتی تھی اور ماجدہ بی بی بیٹھک سے گلی میں ہوتی تھیں۔ مجھے علم ہے اُن کے ہمسایوں کا لڑکا ڈاکٹر عبدالخالق ان سے چوری چھپے ملنے آتا تھا پر میں نے آج تک کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ہاں۔ ایک بار میں دل ہی دل میں ہنسا ضرور تھا۔ ماجدہ بی بی کی کہیں اور شادی ہو گئی۔ تین پیارے پیارے بیٹے ہو چکے تھے۔ تب لاہور سے ان کی بھتیجی کی شادی کی ویڈیو فلم آئی تھی۔ اس میں گھر کی بچیوں نے خوب ناچ گانا کیا تھا۔ شادیوں کے موقعہ پر سارے گھروں میں ایسا ناچ گانا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے اللہ بخشے چوہدرانی جی موٹی تازی ہونے کے باوجود بیاہوں کے موقعہ پر خود ناچ گانے میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ لیکن اپنی رشتے کی بھتیجی کی شادی کی ویڈیو فلم دیکھ کر ماجدہ بی بی نے کہا تھا یہ کیسٹ بچوں کے سامنے نہیں چلانی، ان کی تربیت پر برا اثر پڑے گا۔ تب میں دل ہی دل میں بہت ہنسا تھا۔ پر میں نے آج تک ماجدہ بی بی کو بھی یہ خبر نہیں ہونے دی کہ مجھے ان کے ڈاکٹر عبدالخالق سے ملنے ملانے کے سارے چکروں کا پتہ ہے۔

سلیمہ بی بی کی ایک بیٹی رئیسہ نے جب محلے میں پر پرُزے نکالنے شروع کئے۔ مجھے ساری باتوں کا علم تھا پر کیا کرتا، نمک حلالی کا تقاضہ تھا کہ خاموش رہتا۔ یوں بھی ان کے ایک رشتہ دار نے جب سلیمہ بی بی کو اُن کی بیٹی رئیسہ کی سرگرمیوں کے بارے میں تھوڑا سا آگاہ

کیا تھا تاکہ کسی بڑی خرابی کے ہونے سے پہلے ہی بچ بچا کر لیا جائے تو سلیمہ بی بی خرابی دور کرنے کی بجائے الٹا اس رشتہ دار سے لڑنے چلی گئی تھیں۔ اپنی سب سے بڑی بہن حلیمہ بی بی کو بھی ساتھ لے گئیں۔ لڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس رشتہ دار نے جو بات پہلے پردے میں رکھ کر کہی تھی پھر کھول کر بیان کر دی اور اس کھول کر بیان کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ حلیمہ بی بی نے سلیمہ بی بی کی دوسری بیٹی راشدہ کا رشتہ لینے کی جو بات پکی کر رکھی تھی اسے توڑ دیا۔ اپنے بیٹے کا بیاہ کہیں اور کر دیا۔ حالانکہ اللہ جانتا ہے راشدہ بی بی تو بہت ہی اچھی اور نیک بچی ہے۔ رئیسہ بی بی جیسی بالکل نہیں ہے۔ سلیمہ بی بی کا میاں جب اپنی بیٹی کے لچھنوں سے آگاہ ہوا تو دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ بڑا غیرت مند چوہدری تھا جی!۔ اس قسم کی ڈھیر ساری باتیں میرے علم میں ہیں پر میں نے آج تک اس خاندان کی پردہ پوشی کی ہے کیونکہ میں اس گھر کا نمک خوار ہوں۔

اللہ بخشے چوہدرانی جی بہت بڑے دل والی تھیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب کاروبار کے سلسلے میں ایک بار افریقہ گئے تو تین سال کے بعد واپس آئے۔ پھر گئے تو پانچ سال کے بعد واپس آئے۔ مجال ہے چوہدرانی جی کے جیتے جی کبھی ایسی کوئی بات ہوئی ہو۔ یہ ساری باتیں تو بڑی چوہدرانی جی کے اٹھ جانے کے بعد ہی ہونے لگی تھیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب ویسے بڑے متقی انسان ہیں۔ سچی بات ہے میں نے ان میں عیب اور گناہ والی کوئی بات نہیں دیکھی پر اب تہتر برس کی عمر میں انہوں نے نئی شادی کر کے بڑی زیادتی کی ہے۔ بوڑھوں میں ہی نہیں، جوانوں میں بھی ان کی ٹور تو بن گئی ہے کہ اس عمر میں بھی اتنا دم خم ہے کہ نئی شادی کر لی۔ پر ایسی ٹور کا فائدہ؟۔ اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ جب تہتر برس کی عمر میں بھی چوہدری اللہ دتہ صاحب سے صبر نہیں ہو سکا تو پھر اس زمانے میں انہوں نے خاک صبر کیا ہو گا جب وہ کئی کئی برس بیرون ملک اکیلے گزار کر آتے تھے۔ تب وہ اچھے بھلے جوان تھے۔ ضرور ادھر اُدھر منہ مارا ہو گا لیکن مہارت کے ساتھ۔

لوگ چوہدری صاحب کے منہ پر بے شک بات نہ کریں لیکن آپس میں سب

باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے خود لوگوں کی باتیں سنی ہیں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب نے دوسری شادی بھی کی تو کیسی فضول سی جگہ۔ یہ عورت تو عمر میں اُن سے بیس سال چھوٹی ہے لیکن پہلے ایک جج کی بیوی رہ چکی ہے۔ جج نے اس پر برائی کا الزام لگا کر اسے طلاق دے دی تھی۔ اور وہ عورت ابراہیم کی بیٹی جو نئی چوہدرانی کی گہری دوست ہے۔ منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔ اس نے شادی والے دن چوہدری اللہ دتہ صاحب کو سالی بن کر دودھ پلایا تھا اور دودھ پلائی کے پیسے لئے تھے۔ نئی چوہدرانی کی یہ منہ بولی بہن اپنے گاؤں کی وہ تاریخی لڑکی ہے جو اپنی جوانی میں گاؤں سے بھاگی تھی۔ کسی لڑکی کے گاؤں سے بھاگنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ کم بخت بھاگی بھی غیر مذہب والے کے ساتھ۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ چوہدری اللہ دتہ صاحب نے بڑی چوہدرانی جی کی جگہ پر ایک ایسی پرکٹی کو لا بٹھایا ہے جو پاک دامنی کے معاملہ میں ہماری بڑی چوہدرانی جی کے قدموں میں بیٹھنے کے بھی لائق نہیں۔ یہ تو جی سراسر ظلم ہے!۔ یہ لوگ باگ بھی بڑے فنکار ہیں۔ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ ایک کہہ رہا تھا کہ نکاح کے چھوہاروں اور مکھانوں کے ساتھ ٹافیاں اور غبارے کیوں تقسیم کئے گئے؟ کیا پتہ کیوں تقسیم کئے گئے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ چوہدری اللہ دتہ صاحب اندر سے بالکل خالی ہیں۔ پھوکی ٹور بنانے کے لئے انہوں نے شادی کا تماشا کیا ہے۔ اگر واقعی چوہدری میں دم خم ہے تو پھر اس بیوی سے بھی اولاد پیدا کر کے دکھادیں۔ وہ حرامی جب یہ بات کر رہا تھا مجھے ایسا لگا جیسے چوہدری اللہ دتہ صاحب نے یہ بات سن لی تھی۔

میں بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھا۔ میرا تو رونا تو صرف یہ ہے کہ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ دراصل کل رات چوہدری اللہ دتہ صاحب نے مجھے کہا تھا کہ ان کے بیڈروم کی سیٹنگ تھوڑی سی تبدیل کر دوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ ضروری ہدایات بھی دی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بیڈروم تک پہنچایا تھا اور دروازے سے ہی لوٹ گئے تھے۔ میں اندر گیا تو وہاں نئی چوہدرانی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے کمرے کی سیٹنگ تھوڑی سی تبدیل کرنی ہے اس لئے وہ ذرا باہر تشریف لے جائیں لیکن وہ باہر جانے کی بجائے

میرے قریب آگئیں۔ان کی آنکھیں اور چہرہ عجیب سا ہوتا جارہا تھا۔اب میں کیا بتاؤں کہ وہ کیا کرنے لگی تھیں۔ جب وہ مجھ سے بالکل ہی لپٹ گئیں تب میں گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگا لیکن بدحواسی میں مجھ سے دروازہ نہیں کھل سکا اور میں قریب کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا۔ باہر سے گھوم کر میں اندر آیا۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب کو تلاش کیا۔ پتہ نہیں وہ بتائے بنا کہاں چلے گئے تھے۔ مجبوراً میں پھر چوہدری صاحب کے بیڈروم کی طرف گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بیڈروم کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کنڈی کھولی تو نئی چوہدرانی سامنے کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ انہوں نے قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور "نمک حرام" کہہ کر بیڈروم کا دروازہ زور سے اندر سے بند کر لیا۔

بتایئے بھلا میں نے نمک حرامی کہاں کی ہے۔ خدا کی قسم میں نمک حرام نہیں ہوں۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب کل رات کے کہیں گئے ابھی تک واپس نہیں آئے۔ وہ آجاتے تو وہ خود گواہی دیتے کہ بھولا اور سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن نمک حرام نہیں ہو سکتا۔ پر یہ چوہدری اللہ دتہ صاحب کل رات سے اچانک کہاں چلے گئے ہیں اور ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟

اور وہ بیڈروم کی کنڈی باہر سے کس نے لگائی تھی؟

رب جانے یہ کیا چکر ہے!

شناخت

زندگی کی ہر برہنہ شاخ پر تحریر ہیں
پھول چہروں پر جو ٹوٹے زرد لمحوں کے عذاب

"پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ"

"پاکستان۔ پلید ستان"

"لے کے رہیں گے پاکستان"

"ست سری اکال......"

"حیّ علی الصلوٰۃ......"

"بانگ نئیں دین دیاں گے۔ ساڈیاں رناں بانگیاں جاندیاں نیں"

"مسجد شہید گنج......"

"گورو گوبند سنگھ جی کے بچے......"

"ہندو مسلم بھائی بھائی"

جئے ہند۔ جئے ہند"

ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ زندگی کانپنے لگی۔ پاکستان آزاد ہو گیا۔ اس کے ذہن میں سارے منظر، ساری تاریخ اتھل پتھل ہو کر رہ گئی۔ کوئی منظر ٹھیک طرح سے آنکھوں میں نہیں سما رہا، تاریخ کا کوئی حصہ ڈھنگ سے ذہن میں نہیں آ رہا۔ چاروں طرف آگ اور خون کا کھیل تھا، اُن کے قافلے پر حملہ کر دیا گیا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں سب گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں گہرا اندھیرا اُتر آیا تھا مگر اچانک اس اندھیرے میں روشنی کی ہلکی سی لکیر ابھری۔ قریبی کھیتوں میں اسی روشنی کی لکیر کے سہارے وہ چھپتے چھپاتے ساتھ والے گاؤں جا نکلی تھی مگر وہاں پہنچ کر اس کی آنکھوں میں اُترا ہوا اندھیرا اور گھنا ہو گیا تھا اور روشنی کی اس ہلکی لکیر نے بھی اس اندھیرے میں دم توڑ دیا تھا:

"کون ہو تم؟"

"جی۔ مم۔ میں۔ رشیدہ ہو"

"ہا۔۔۔ہاہاہا۔۔۔" شیطانی قہقہے اس طرح گونجے جیسے کسی ملک کو فتح کرنے کا آخری مرحلہ آ گیا ہو۔

"مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دیں۔ خدا کے لئے!۔ مجھے میرے پاکستان بھجوا دیں" وہ گڑگڑائی

"سنو! تم اب رشیدہ نہیں، پرکاش کور ہو"

بے بسی کی حالت کے باوجود پتہ نہیں اس میں کہاں سے اتنی قوت آ گئی۔ اس نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا:

"میں مسلمان ہوں اور میرا نام رشیدہ ہے، رشیدہ!"

تب سکھ لیڈر کے اشارے پر سات سکھوں نے اسے دبوچ لیا اور اسے بازوں، ٹانگوں اور بالوں سے پکڑ کر کسی انجانی سمت لے جانے لگے۔ رستے میں سکھ لیڈر نے طنزاً کہا:

"اب بتاؤ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟"

"لا إِلٰہ الا اللہ...... " انہوں نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا مگر پھر بھی اس نے جیسے تیسے پورا کلمہ پڑھ دیا"...... محمد الرسول اللہ"

وہ اسے ایک خالی مکان میں لے گئے اور وہاں جا کر ایک کمرے میں زور سے پٹخ دیا۔

"اسلام کے دشمنو! انسانیت کے دشمنو! ہماری اذانیں بند کرنے والے کتو اور درندو!"

رشیدہ کے منہ سے گالیوں کا طوفان بہہ نکلا۔ لیڈر سکھ نے باقی سکھوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس پر تھپڑوں کی بارش شروع کر دی۔ تشدد کے باوجود اسے اصرار تھا کہ وہ رشیدہ ہے اور اسے اس کی ماں کے پاس یا پھر پاکستان پہنچایا جائے۔ تب لیڈر سکھ نے نہ صرف اس کی آبروریزی کی بلکہ اس عمل کے دوران اسے باور کراتا رہا کہ وہ اب رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے کیونکہ اب وہ مسلمان نہیں سکھ ہے۔ تکلیف اور اذیت کے عالم میں "لے کے رہیں گے پاکستان"،" جئے ہند" اور "ست سری اکال" کے نعرے بھی اسے ریپ کرتے رہے اور اسے اس کا نیا نام یاد کراتے رہے۔ وہ چیخی چلائی تو لیڈر سکھ نے دھمکی دی کہ اگر وہ درست نہ ہوئی تو وہ اپنے گروہ کے باقی سات جوانوں کو بھی اندر مدعو کر لے گا۔ تب وہ نہایت بے بسی کے ساتھ سسک پڑی اور درست ہو گئی اور اسے یقین آ گیا کہ اس کا نام رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے اور پھر وہ سچ مچ پرکاش کور بن گئی۔ لیڈر سکھ سریندر سنگھ کی بیوی!

اس کے اندر کی رشیدہ اس سے گزرے ہوئے، بھوگے ہوئے اور سنے ہوئے واقعات کی کوئی بات کرتی تو وہ اسے سختی سے ڈانٹ دیتی۔ کسی نعرے کا مطلب پوچھتی تو اسے ٹوک دیتی۔ سکھوں کے دور میں مسلمانوں کی اذانوں پر پابندی کی بات ہو یا مغلیہ دور میں گورو گوبند سنگھ جی کے بچوں کے قتل کا واقعہ، پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ ہو یا پلید ستان۔ وہ تو اپنا مطلب، اپنے معانی گم کر بیٹھی تھی۔ اس کے لئے اب ہر چیز بے معنی تھی۔ اس نے اپنی بے معنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا اور اس سمجھوتے نے بے معنویت سے ایک نئی معنویت

پیدا کر دی۔ دو گبھرو بیٹے اور ایک خوبصورت بیٹی۔ لیکن وہ جب بھی اپنے ماحول سے مطمئن ہونے لگتی، اندر کی بے اطمینانی اور بڑھ جاتی۔ اطمینان اور بے اطمینانی کی اسی حالت میں زندگی کو جھیلتے، بھوگتے وہ بڑھاپے کی منزل تک آ گئی۔

تب یکا یک ایک اور دھماکہ ہوا۔ زندگی کانپنے لگی۔

"اندرا گاندھی قتل ہو گئیں"

انتہا پسند ہندؤں کو کھل کر کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ سکھوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ اس کے ذہن میں خوفناک وسوسے اور اندیشے سر اٹھانے لگے۔ وہ اپنے کمزور اور بوڑھے ہاتھوں سے اپنی جوان بیٹی کو مضبوطی سے تھامنے لگی۔ ۔ فساد شدت اختیار کرنے لگا۔ سریندر سنگھ سرکاری حفاظتی کیمپوں میں رہائش کا بندوبست کرنے گیا ہوا تھا۔ تب اس کے گھر کی دہلیز پر ہی اس کے دونوں جوان بیٹے قتل کر دیئے گئے اور گھر کو آگ لگا دی گئی۔ وہ اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لے کر گھر کی پچھلی طرف سے دیوار پھاند گئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے گئی ہوں گی کہ پیچھے سے للکار سنائی دی:

"ٹھہرو۔ کون ہو تم؟"

جج......جی......" وہ ہکلائی۔ سینتیس[۳۷] سال پہلے کا زمانہ پھر اس کے سامنے آ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

پرکاش کور۔ نہیں رشیدہ، جی ہاں رشیدہ"

جھوٹ بولتی ہو۔ تم مسلمان نہیں، سکھ ہو"

"گورو کی سوگند۔ بھگوان کی قسم۔ میں رشیدہ ہوں اور یہ میری بیٹی ہے، چترا۔ نہیں اسکا نام چترا نہیں ...... اس کا نام......" وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی، سوچتی رہی، سوچتی رہی۔ اس کے سوچتے سوچتے اور دیکھتے دیکھتے سامنے کا منظر بدل چکا تھا۔ چترا ایک مکان کے کمرے میں مقید تھی اور وہ برآمدے میں بے بس بندھی کھڑی تھی۔ آٹھوں بدمعاش اس کی بیٹی کو باری باری ریپ کر رہے تھے۔ چترا بے ہوش ہو چکی تھی مگر بلوائیوں کے انتقام کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں سارے منظر، ساری تاریخ اتھل پتھل ہو کر

رہ گئی تھی۔ اس کی حالت ایسے انسان کی طرح تھی جس کے چاروں طرف الگ الگ موضوعات کی فلمیں پوری آواز کے ساتھ چل رہی ہوں اور اسے کچھ بھی نہ سوجھ رہا ہو۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کے سامنے چترا نہیں وہ خود پڑی ہوئی ہے اور وحشیوں کا یہ غول اسے اس کا نام یاد کرا رہا ہے۔ ہر آدمی اسے سریندر سنگھ نظر آتا ہے۔

رشیدہ نہیں پرکاش کور۔ پرکاش کور نہیں رشیدہ"

تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نام نہیں اور کوئی مذہب نہیں۔

وہ صرف ایک لڑکی ہے۔ ایک عورت ہے۔

یہی اس کا نام ہے۔

یہی اس کا مذہب ہے۔

انکل انیس

باہر کے شیطان خرابی سی کر جاتے ہیں
ورنہ ہر انسان کی فطرت نوری ہوتی ہے

مسز توصیف انور میری دور کی رشتہ دار ہیں۔ بس نام کا رشتہ ہے۔ البتہ ان کے شوہر انور صاحب سے میرا محبت کا گہرا رشتہ ہے۔ اُن کی پہلی بیوی فوت ہو گئیں تو انہوں نے اپنی بہن کی مدد سے مسز توصیف سے شادی کر لی۔ تب انور صاحب ۴۵ سال کے تھے اور مسز توصیف ۲۵ سال کی۔ اگرچہ مسز توصیف نے شادی سے پہلے یہ بات چھپائی تھی کہ وہ طلاق یافتہ ہیں تاہم کچھ ان کی کم عمری نے اور کچھ انور صاحب کی طبعی شرافت نے اس اخفا کو مسئلہ نہیں بننے دیا۔

یہ لگ بھگ بیس برس پہلے کی بات ہے۔ انور صاحب کی پہلی بیوی سے چھوٹی بیٹی اپنی پھوپھی کے ہاں تھی۔ مجھے وہاں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ نو سال کی بچی کو لاہور انور صاحب کے گھر پہنچا آؤں۔ ٹرین سے رات بھر کا سفر کر کے جب میں لاہور پہنچا تو انور

صاحب آفس جاچکے تھے۔ سفر کی تھکن کے باعث میں نہاکراور ناشتہ کر کے سوگیا۔ پھر پتہ نہیں کیسے میری آنکھ کھلی، لیکن جب میں جاگا تو ڈرائینگ روم سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔انور صاحب کی بیٹی کسی مہمان کوانکل انیس کہہ رہی تھی۔انکل انیس مصر تھے کہ بچی باہر سے جاکر اسکنجبین کے لئے لیموں خرید آئے۔ بچی بھی اپنی معصومیت میں کہہ رہی تھی ہاں انکل!میں ابھی جاکر لے آتی ہوں لیکن مسز توصیف بار بار بچی کو باہر جانے سے روک رہی تھیں۔ آخراُن کی سرگوشی جیسی آواز سنائی دی:

''انیس!بے وقوفی مت کرو۔اندرانور صاحب کاایک عزیز سویاہواہے''

اس سرگوشی کی آواز سن کر میں جان بوجھ کر سویا ہوابنارہا حالانکہ میراپوراوجود جاگ گیاتھا۔

میں جنس کوزندگی کی ایک حقیقت سمجھتا ہوں۔ معاشرتی حدود میں رہ کراس کے تقاضے پورے ہوں توزیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر کوئی اُن سماجی حدود کو باہمی رضامندی اور خاموشی سے پھلانگتا ہے تو میں اس پر خاموش رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ہر کسی کی اپنی زندگی ہے۔کوئی جیسے چاہے بسر کرے۔ میں دودن لاہور رہا۔اس دوران انکل انیس سے دوملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے مسز توصیف یاانکل انیس کو ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ مجھے ان کے ناجائز مراسم کاعلم ہوگیاہے۔ بعد میں جب بھی کبھار لاہور جاناہوتاانور صاحب کے گھر پرانکل انیس سے بھی ایک آدھ ملاقات ہو جاتی۔ لیکن چند برسوں کے بعد مجھے یہ حیران کن خبر معلوم ہوئی کہ انور صاحب کے ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے دوستانہ مراسم تھے۔انور صاحب کے گھر پراس دن کوئی نہیں تھاچنانچہ انور صاحب اور وہ ہیڈ مسٹریس تنہائی کی موج میں دوستانہ مراسم سے آگے، کافی آگے تک چلے گئے۔انور صاحب زندگی میں پہلی بار گناہ کی لذت سے آشنا ہوئے تھے جبکہ مسز توصیف اس میدان کی تجربہ کار کھلاڑی تھیں۔انہوں نے ایک ہی جھٹکے میں انور صاحب سے سچ اگلوالیااور پھر قرآن اٹھوایاکہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔انور صاحب جو پہلے ہی عمروں کے نمایاں فرق کے باعث بیوی کے دباؤ میں تھے مزید

دباؤ میں آگئے۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا، مجھے شدید دکھ ہوا۔ انور صاحب کا گناہ بے شک گناہ تھا۔ لیکن ان سے قرآن اٹھوانے والی مسز توصیف کو اس کا کیا حق پہنچتا تھا؟۔ چھاج تو بولے پر چھلنی کیوں بولے۔ ہماری دنیا، سارے معاشرے، سارے فرقے۔ سب کے نزدیک مجرم وہی ہے جو پکڑا جائے۔ جو مہارت کے ساتھ جی بھر کر گناہ کرے، جرائم کا مرتکب ہو لیکن پکڑا نہ جائے وہ متقی، پرہیز گار اور مومن ہے۔ بارہا یہ خیال آئے کہ انور صاحب کو جا کر ان کی بیگم کے کرتوت بتادوں، پھر سوچتا چلو انور صاحب پر ایک قیامت تو گزر چکی اب انہیں ایک اور قیامت سے کیوں دوچار کروں۔ جیسی بھی سہی اُن کی زندگی گزر تو رہی ہے، گھر بسا تو ہوا ہے۔ آخر میں نے راز افشا کرنے کی بجائے پردہ پوشی کرنے کو ترجیح دی۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد آج مجھے یہ ساری باتیں پھر سے یاد آگئی ہیں۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ میں ہوٹل پر لنچ کرنے گیا تھا۔ وہاں اچانک انکل انیس دو معزز بیگمات شمیم خانم اور رضیہ بیگم کے ساتھ آن ٹپکے۔ رسمایا مروتاً ہی نہیں میں نے انکل انیس کو دلی طور اپنے ساتھ لنچ کی دعوت دی جو بخوشی قبول کر لی گئی۔ دوران گفتگو پتہ چلا کہ لبرل سوچ رکھنے والے دوستوں نے مل کر خواتین کے حقوق کے سلسلے میں ایک نئی تنظیم قائم کی ہے۔ اس تنظیم کی نئی شاخیں کھولنے کے لئے اور کارکردگی بڑھانے کے لئے مختلف شہروں کا دورہ کیا جارہا ہے۔ میرے ساتھ ان کی ملاقات اتفاقیہ تھی اور اسے کھانے کی میز پر ہلکی پھلکی گپ شپ تک ہی محدود رہنا چاہئے تھا لیکن تنظیم سازی کے جوش میں میرے سامنے بھی انہوں نے خواتین کے حقوق کے مسئلہ پر رٹی رٹائی جوشیلی باتیں شروع کر دیں۔ میں خواتین کے حقوق کا مخالف نہیں ہوں۔ خواتین کو معاشرے میں ان کا جائز مقام ملنا چاہئے۔ صدیوں سے روا رکھی جانے والی ناانصافی کا خاتمہ ہونا چاہئے لیکن انکل انیس کے منہ سے خواتین کے حقوق کی باتیں مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ ایک مرحلے پر میں نے ان سے پوچھا: ”اس انقلابی مہم میں مسز توصیف نے آپ کا ساتھ نہیں دیا؟“

”ارے وہ تو نری مولوانی ہے۔ اسے ایسے انقلابی محاذ پر آنے کی ہمت ہی نہیں“

انکل انیس کا جواب سن کر جی چاہا کہہ دوں "انکل! وہ مولوانی ہرگز نہیں ہیں۔ انہوں نے نماز اور تسبیح کی آڑ لے کر آپ کے ساتھ ناجائز مراسم قائم کرنے کی ہمت کر لی تھی تو اس کارِ خیر میں آگے آنے کی ہمت کیوں نہیں کر سکتیں۔" لیکن میں یہ بات نہ کہہ سکا۔ اس کی بجائے میں نے انہیں بتایا کہ "جن عورتوں پر ظلم ہوتے ہیں وہ زیادہ تر دیہاتوں میں رہتی ہیں، شہروں کے تنگ و تاریک محلوں میں رہتی ہیں۔ اس لئے اگر آپ واقعی خواتین کے حقوق کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنی تنظیم کی بیگمات کو کام کرنے کے لئے دیہاتوں میں بھیجئے، شہروں کے پرانے اور تنگ و تاریک محلوں میں بھیجئے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن، ماڈل ٹاؤن اور اس طرح کی نئی آبادیوں میں مقیم خواتین بڑی حد تک اپنے حقوق سے آگاہ ہیں"۔ تب انکل انیس کی بجائے شمیم خانم نے مجھے ٹوکا اور بتایا کہ "ماڈرن علاقے کی خواتین کے حقوق بھی پامال ہو رہے ہیں۔ ہم نے اپنا کام ابھی شروع کیا ہے۔ آہستہ آہستہ ہم پسماندہ محلوں اور دیہاتوں کی طرف بھی جائیں گے۔ ہمیں اس غیر متوازن معاشرے کو متوازن بنانا ہے"

"آپ کے خیال میں یہ متوازن معاشرہ کیسے وجود میں آئے گا؟"

"جب مرد اور عورت کی تفریق کے بغیر صرف انسان کی بات کی جائے گی"

"اگر یہ بات ہے تو پھر انسان کے زمرہ میں صرف مرد اور عورت کو ہی نہیں سمجھیں۔ مخنثوں کو بھی اس میں شامل کریں۔ انسانی برادری میں سب سے زیادہ تضحیک، ظلم اور استحصال کا شکار تو پھر مخنث طبقہ ہے۔"

"یہ طبقہ بھی مردانہ چیرہ دستی کا شکار ہے" اس بار رضیہ بیگم بولیں۔

"تو پھر آپ لوگ اپنی جدوجہد انکل انیس کے بغیر شروع کریں" میری بات سن کر انکل انیس نے قہقہہ لگایا لیکن ان کے چہرے سے خفت عیاں تھی۔ "نہیں۔ ابھی ہماری جدوجہد ابتدائی مرحلے میں ہے اس لئے ہمیں ابھی صرف خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنا ہے اور اس کارِ خیر میں جو مرد حضرات ہمارا ساتھ دیں گے ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے" شمیم خانم نے بڑے سلیقے سے جواب دیا۔

"مرد ساری زندگی عیاشی کرتا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ عورت سے زندگی میں ایک بار بھول ہو جائے تو اس کی ساری زندگی اجیران کردی جاتی ہے" رضیہ بیگم کے لہجے میں تلخی تھی، انہوں نے جیسے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔ میں بھی اسی سمت مڑ گیا:

"تو کیا اس جدو جہد کا یہ مقصد ہے کہ چونکہ مرد عیاشی کرتے ہیں اس لئے عورتوں کو بھی عیاشی کرنے کا حق ملنا چاہیے"

"دیکھیں! اب آپ شدید زیادتی پر اُتر آئے ہیں" انکل انیس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"آپ مجھے یہ بتائیں کہ جس طرح مرد اپنی کسی رشتہ دار عورت کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر غیرت کے نام پر قتل کر دیتا ہے۔ عورت کو بھی آپ ایسی ہی غیرت کا مظاہرہ کرنے کا حق دیں گے جب اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ویسی ہی قابل اعتراض حالت میں پایا جائے" رضیہ بیگم کی بات میں خاصا وزن تھا لیکن میرا اندر کا مسئلہ تو انکل انیس کو زچ کرنے کا تھا اس لئے میں نے پینترا بدل کر بات سنبھالنی چاہی'

"میں تمام معزز خواتین سے معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے بتائیں کہ خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے کی دعوے دار خواتین میں کتنی ہیں جو عاصمہ جہانگیر کی طرح ٹھوس اور عملی کام کر رہی ہیں اور کتنی ہیں جو سیمناروں اور دوروں کے ذریعے اپنے شوہروں کے بغیر دوسرے مردوں کے ساتھ پتہ نہیں کہاں کہاں کی سیاحت فرما رہی ہیں"

"یہ تو آپ براہ راست ہماری توہین کر رہے ہیں" دونوں بیگمات ایک ساتھ بولیں۔

"خواتین کے حقوق کی چیمپئن ایک عورت کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اسنے اپنے جسم کو زینہ بنایا اور ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ جب عمر ڈھل گئی تو اعلیٰ افسران کو لڑکیاں سپلائی کرنے لگی۔ بڑی معروف عورت ہے۔ عورتوں کے حقوق کے لئے سب کچھ

کر گزرتی ہے"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں مزید بیٹھنا نہیں چاہئے" انکل انیس یہ کہہ کر غصے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں بیگمات بھی جلالی شان کے ساتھ اٹھ گئیں۔

"انکل انیس! یہ سیدھی سادی بحث تھی لیکن آپ ناراض ہو ہی گئے ہیں تو جاتے جاتے یہ کڑوا سچ بھی سن لیجئے کہ خواتین کے لئے اتنے حقوق مانگیے جتنے آپ اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کو دے سکیں۔ کیا آپ اپنی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کو یہ حق دیں گے کہ وہ کسی اور انیس صاحب کے ساتھ اسی طرح دورے کریں؟" میری بات مکمل ہو چکی تھی۔ انکل انیس دونوں معزز خواتین کے ساتھ ہوٹل سے باہر جا چکے تھے۔

بیرا چار کھانوں کا جو بل لایا تھا خاصا بھاری تھا لیکن بل ادا کرتے وقت میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے مسز توصیف سے اس زیادتی کا تھوڑا سا بدلہ لے لیا ہے جو انہوں نے انور صاحب کے ساتھ کی تھی۔

۲۷۵۰ سال بعد

اب آگے رُخ یہ کونسا کرتی ہے اختیار
حیدرؔ یہ منحصر ہے مری داستان پر

میں وہ اوڈیس(ODYSSEUS) ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں اس لئے مجھے اپنے کردار کے علاوہ ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے۔ کئی صدیوں کے بعد جب تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے تو سب کچھ عین اسی طرح نہیں ہے جیسا پہلے تھا۔ تاہم تاریخ کے مرکزی کردار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بڑی حد پہلے جیسے ہیں۔ واقعات کی نوعیت میں بعض بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں اس کے باوجود واقعات کا انجام بہر حال پہلے سے کہیں بہتر ہونے کی امید ہے۔

اس بار ٹرائے کے بادشاہ PRIME کے بیٹے شہزادہ پیرس نے مِنی لیس (MENELAUS) کی بیوی ہیلن کو اغوا نہیں کیا اس لئے ایگا میمنن(AGAMEMANON) کو دس سال تک ٹرائے کا محاصرہ کر کے بھائی کی اہانت کا انتقام لینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں

آئی۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اس کی بیوی کلائی ٹمنسٹرا (CLYTAEMNESTRA) سے اس کے شدید اختلاف پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ اختلافات بڑی حد تک اجستھس (AEGISTHUS) کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ تاہم اس بار وہ ایگا میمنن کو قتل کرانے کی بجائے اس سے باضابطہ طلاق حاصل کر کے اجستھس سے شادی کر لیتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی ہے لیکن کلائی ٹمنسٹرا کا کہنا ہے کہ اس نے کوئی جرم یا گناہ نہیں کیا۔ جب ایگا میمنن سے نباہ نہیں ہو سکا تو اس سے علیحدگی اختیار کر کے کسی بہتر جگہ شادی کر لینا اس کا حق تھا۔ سو اس نے قانون کے دائرے کے اندر رہ کر قانونی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنا حق استعمال کیا ہے۔ اس بار میری بیوی پینی لوپی (PENELOPE) رشتے میں کلائی ٹمنسٹرا کی سگی اور بڑی بہن ہے حسن و سیرت، شوہر پرستی، عفت و عصمت اور وفا پرستی کے سارے اوصاف پہلے کی طرح اب بھی اس میں موجود ہیں۔

سمندری دیوتا پوسی ڈان (POSEIDON) اس بار خود مصیبت میں گھرا ہوا ہے۔ دراصل اس نے سمندر کی بعض بڑی مچھلیوں اور مگر مچھوں کو حد سے زیادہ اختیارات دے کر سر چڑھا دیا تھا۔ اس سے بعض ایسی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ بعض بادشاہ بھی سمندری دیوتا کے مخالف ہو گئے اور اسے اپنے مرکز سے فرار ہو کر ایک محفوظ جگہ جا کر پناہ گزین ہونا پڑا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی بعض قوتوں کے زور سے سمندر پر اپنا اثر رسوخ قائم رکھا ہے البتہ اس کی غیر موجودگی کے باعث اس کی سر پر چڑھائی ہوئی بڑی مچھلیوں اور مگر مچھوں کو مزید کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

میں سمندری دیوتا کی صلاحیتوں، بالخصوص سیاسی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ شاید میرے دل میں کہیں ابھی بھی اس کے لئے تھوڑی بہت محبت کے جذبات موجود ہوں۔ پوسی ڈان کے دادا سے تو میں اب بھی متاثر ہوں۔ سمندری دیوتا سے میرے اختلاف کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ میں بڑی مچھلیوں اور مگر مچھوں کے بے جا اختیارات اور ظالمانہ اقدامات کی مذمت کرتا ہوں جبکہ سمندری دیوتا کا خیال ہے کہ اس کے مقرر کردہ

مشیروں کی مذمت کرنا خود دیوتا کی مذمت کرنے کے مترادف ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سمندر کی گہرائی اور وسعت کے احساس کے باوجود میرا خیال ہے کہ سورج، سمندر سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ اسی لئے میں سمندری دیوتا کے مقابلہ میں سورج دیوتا کو کہیں زیادہ عظیم سمجھتا ہوں۔ بس ایسے اختلافات کی بنیاد پر سمندری دیوتا میرا مخالف ہو گیا ہے۔ اس نے سمندری بلاؤں کو حکم دیا کہ مجھے ہلاک کر دیں۔ سمندر کی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ تو مجھ پر پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ حکم ملتے ہی مجھے ہلاک کرنے کے لئے لپکے۔ ان کے بڑے بڑے اور ہولناک جبڑوں سے پھسل کر میں ایک نوالے کی طرح ان کے حلق میں اتر جاتا لیکن شدید غصے کے باعث وہ میرے ٹکڑے کر کے اور مجھے چبا چبا کر کھانا چاہتے تھے۔ شاید ان کے ذہن میں یہ خوف ہو کہ اگر مجھے سالم نگل لیا گیا تو ہو سکتا ہے یونس نبی کی طرح میں پھر زندہ نکل آؤں۔ یوں بھی انہیں نہ صرف میری ذاتی مظلومیت اور سچائی کا اندر ہی اندر احساس تھا بلکہ اپنی بعض ظالمانہ حرکات کا قدرتی ردِّ عمل بھی وہ دیکھ چکے تھے لیکن بجائے شرمندہ ہونے کے میرے خلاف ان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بہر حال مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھانے کے شوق میں ان کا وار ناکام ہوا اور میں بحفاظت سمندر میں سے نکل آیا۔ اسی دوران سمندری دیوتا کی طرف سے اور اس کے متعدد پجاریوں کی طرف سے پینی لوپی کو پیار، محبت کے ساتھ یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی کہ چونکہ میں سمندری دیوتا کا باغی اور دھتکارا ہوا ہوں اس لئے وہ مجھ سے علیحدگی اختیار کرے۔ اس بار ستم ظریفی یہ ہے کہ پینی لوپی خود سمندری دیوتا سے گہری عقیدت رکھتی ہے۔ اس کے خاندان کے سارے لوگ سمندری دیوتا کے پجاری ہیں۔ تاہم پینی لوپی نے اس ساری صورت حال کے باوجود بڑی حکمت اور دانشمندی کے ساتھ اپنے اوڈیسس سے علیحدگی کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ اس دوران تماشہ یہ ہوا کہ جن پجاریوں نے پینی لوپی کو مجھ سے علیحدگی کا مشورہ دیا تھا اُن سب کے اپنے بیٹوں، بیٹیوں کے گھر اُجڑنے لگے۔ تب سمندری دیوتا نے غضب ناک ہو کر میرے خلاف فرمانِ عام جاری کیا لیکن اس فرمان عام کے جاری ہونے کے دو ماہ کے اندر سمندر کے بعض حصوں میں ایسا

شدید طوفان آیا کہ سمندر کی پوری تاریخ میں کبھی ایسی تباہی نہیں مچی۔ سمندر کا ایک چھوٹا سا حصہ اسکندریہ تو بالکل ہی برباد ہو گیا۔ تب سمندری دیوتا مزید غضبناک ہوا اور اس نے اپنی قوت کے زور سے میری سلطنت اتھاکا کو اُٹھایا اور اسے سات سمندر پار پہنچا دیا۔ پچھلی دفعہ میں رستہ بھٹک گیا تھا اور مجھے اتھاکا پہنچنے میں دس سال لگ گئے تھے۔ اس بار اتھاکا کو مجھ سے دور کر دیا گیا ہے۔ بظاہر سات سمندر پار کرنے کے لئے مجھے سمندری دیوتا کی خوشنودی حاصل کر لینی چاہیے لیکن میں جانتا ہوں کہ اب ہوائی جہاز کے ذریعے سات سمندر پار کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ اس دوران اگر سمندری دیوتا نے اپنے سیاسی اور سازشی ذہن سے کام لے کر کہیں مجھے مزید الجھانے یا بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو میں نے بھی ڈپلومیٹک رویہ اختیار کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ یوں بھی کسی کو بلیک میل کر کے جھکانے والوں کی انا کی تسکین تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔

پچھلے دنوں پھر سمندری دیوتا کے ایک بے حد اہم پجاری سے اطلاع ملی تھی کہ پینی لوپی کو مجھ سے علیحدگی کا مشورہ دینے کے لئے پھر ایک مشورت ہو رہی ہے۔ لیکن یہ مشورہ جاری کرنے سے پہلے خود سمندری دیوتا کی بیوی کی موت واقع ہو گئی۔ میرا خیال ہے پوسی ڈان کو اب کائنات کے سب سے بڑے مالک کے نظام کی کچھ کچھ سمجھ آ جانی چاہیے۔ یوں بھی جس قسم کا وہ دیوتا ہے اس سے ملتی جلتی قوتیں تو خود میرے اندر بھی موجود ہیں۔ بہر حال مجھے اب سمندری دیوتا کا کوئی ڈر نہیں لیکن نئے زمانے کی بادشاہتوں نے اپنے اپنے قانون بنا رکھے ہیں۔ ایک سلطنت سے دوسری سلطنت تک جانے کے لئے قانونی مرحلوں کو طے کرنا ضروری ہے۔ میرے نزدیک یہ انوکھے اور بے جا قوانین ہیں، تاہم مجھے اتھاکا پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ پچھلی بار میں دس سال بھٹکنے کے بعد اتھاکا پہنچا تھا، اس بار مجھے علم ہے کہ میں اس مدت سے کہیں پہلے اپنے اتھاکا پہنچ جاؤں گا۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، میں وہ اوڈیسس ہوں جسے کوئی ہومر نصیب نہیں۔ اس لئے مجھے ہومر کے حصے کا کام بھی خود کرنا ہے ہومر کے برعکس میری پریشانی یہ ہے کہ میری دونوں آنکھیں سلامت ہیں

اور مجھے کسی بادشاہ سے انعام واکرام بھی نہیں لینا ہے۔ آنکھیں کھلی ہوں تو "دیکھنے" کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔ مجھے ابھی یہ عذاب جھیلنا ہے پھر اسے رقم کرنا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس کے بعد ایک قیامت ٹوٹ پڑے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ اسی قیامت میں کوئی طوفانی لہریا شدید تھپیڑا مجھے اتھاکا پہنچادے گا جہاں میرے عوام کے علاوہ میری پینی لوپی بھی شدت سے میراانتظار کررہی ہے۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتے ہوئے اپنے منطقی انجام کے مرحلوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بے سروسامانی اور غیر یقینی حالات کے باوجود مجھے اب کوئی تشویش نہیں ہے، میں پیش آمدہ صورت حال کو اور تاریخ کے نتائج کو اب بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں ایسے دیوتاؤں یا اُن کے ایسے پجاریوں کی طرح نہیں ہوں جنہوں نے تاریخ سے کبھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔

بھید

بھید اپنے فقط ہمیں جانیں
اپنے منکر نکیر بھی ہم ہیں

میرے بچپن میں ہی میرے اباجی نے ایک طرح میرے دل میں اس کا شوق پیدا کیا تھا۔ وہ مجھے قصے، کہانیاں سنانے کی بجائے بزرگانِ دین کے حالات و واقعات دلچسپ پیرائے میں سناتے۔ ایسے واقعات میں بہت سی باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتی تھیں لیکن انہیں سننے میں انوکھا سا مزہ ضرور آتا تھا۔ ایک دفعہ اباجی نے اپنے مرشد کی جڑواں بہن کے بچپن کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ سنایا:

”جنت بی بی بڑی اللہ والی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ اس نے خواب دیکھا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑی ہے۔ سمندر کی لہریں اس کی ٹانگوں تک آآکر لوٹ جاتی ہیں۔ بیدار ہونے پر جنت بی بی نے اپنی ماں کو اپنا خواب سنایا۔ ماں اس خواب سن کر بے حد حیران ہوئی کیونکہ جنت بی بی کی شلوار بھی گیلی تھی۔“

میں نے اباجی کی بات سن کر بچپنے کی معصومانہ ہنسی کے ساتھ کہا: ”نیند میں ان کی پشی نکل گئی ہوگی۔“

اباجی میری بات سن کر بے ساختہ مسکرا دیئے۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ جنت بی بی کی شلوار صرف گیلی ہی نہیں تھی۔ اس پر سمندر کی ریت بھی چپکی ہوئی تھی۔ اس واقعہ کی پراسراریت نے میرے دل میں یہ شوق پیدا کیا کہ میرے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آئے۔ بڑا ہوا تو کئی کہانیوں میں اس انداز کے فرضی قصے پڑھے لیکن میری خواہش تو ذاتی تجربے کی تھی۔ اسی خواہش کے دوران مجھے دو بزرگوں کے ایسے روحانی تجربات پڑھنے کا موقعہ ملا:

حضرت ابو عبداللہ جلار حمت اللہ علیہ مدینہ منورہ میں قیام فرماتے۔ وہاں انہیں فاقوں کی نوبت آگئی۔ جب بھوک سے بے حال ہوگئے تو روضۂ نبویؐ پر حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں فاقے سے ہوں اور آپ کے ہاں مہمان ہوں۔ اپنی عرض کے بعد نڈھال ہو کر سو گئے تو دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اور اپنے دستِ مبارک سے آپ کو ایک روٹی عنایت فرمائی ہے۔ آپ نے آدھی روٹی کھالی جب نیند سے جاگے تو باقی آدھی روٹی آپ کے ہاتھ میں موجود تھی۔

دوسرا واقعہ حضرت حسن بصریؒ کا تھا:

شمعون نامی ایک ستر سالہ غیر مسلم نے آپ سے کہا میری ساری زندگی تو کفر و ضلالت میں بسر ہو گئی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا اب مسلمان ہو جاؤ۔ شمعون نے کہا اگر آپ لکھ دیں کہ خدا مجھے عذاب نہیں دے گا تو میں ایمان لے آتا ہوں۔ آپ نے خط لکھ دیا۔ تب شمعون نے کہا کہ اس پر بصرہ کے معتبر افراد کی گواہی بھی کرادیں۔ چنانچہ گواہی کرا کے خط شمعون کو دے دیا گیا۔ شمعون مسلمان ہو گیا اور اس نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو یہ خط

میرے ہاتھ میں دے کر مجھے دفن کیا جائے۔ جب شمعون فوت ہوا تو
اس کی وصیت کے مطابق خط اس کے ہاتھ میں رکھ کر اس کی تدفین
کر دی گئی۔ اس رات حضرت حسن بصریؒ سخت اضطراب کی حالت
میں تھے۔ بار بار یہ خیال آئے کہ مجھے اپنی بخشش ہونے کا علم نہیں تو
کسی اور کی بخشش کا خط کیوں لکھ دیا۔ اسی تشویش کے دوران آنکھ لگ
گئی۔ خواب میں دیکھتے ہیں شمعون جنت میں پہنچا ہوا ہے اور حضرت
حسن بصریؒ سے کہتا ہے میرے مولا نے ویسے ہی اتنے کرم کر دیئے
ہیں کہ آپ کے خط کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس لئے اپنا یہ خط
واپس لے لیں۔ حضرت حسن بصریؒ جب بیدار ہوئے تو وہ خط آپ
کے ہاتھ میں موجود تھا۔

ان واقعات کو پڑھنے کے بعد بزرگانِ دین سے تمام تر عقیدت کے باوجود میں ذہنی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا۔ تب میں شوگر ملز میں ملازم تھا۔ دسمبر کے آخری دن تھے۔ اُس شام کو میری شام چھ بجے سے رات دو بجے تک والی شفٹ تھی۔ جب میں ڈیوٹی کے لئے جا رہا تھا تو مجھے ہلکا ہلکا سا بخار ہو رہا تھا۔ میں نے لیبارٹری میں بمشکل دو گھنٹے کام کیا تھا کہ بخار تیز ہو گیا۔ اپنے معاون کو اپنی ڈیوٹی سونپ کر میں لیبارٹری کے متروک ڈارک روم میں چلا گیا۔ وہاں فلٹر کلاتھ کا صرف ایک ٹکڑا پڑا تھا جسے میں نے بچھونا بنا لیا، سرہانے ایک اینٹ رکھی اور سکڑ کر لیٹ گیا۔ جیسے جیسے بخار چڑھ رہا تھا ٹھنڈک کا احساس بڑھ رہا تھا۔ اوپر کوئی رضائی، کمبل یا چادر نہ ہونے کے باعث کپکپی ہونے لگی تھی۔ اچانک ایسے لگا جیسے کسی نے آکر میرے اوپر رضائی ڈال دی ہو اور پھر مجھے گہری نیند آ گئی۔ رات ڈیڑھ بجے جب چھٹی کا پہلا سائرن بجا تو میری آنکھ کھل گئی۔ میرا جسم پسینے سے بھرا ہوا تھا، بخار ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اپنے اوپر پڑی ہوئی رضائی کو ایک طرف کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر یہ کیا؟ ڈارک روم میں کسی رضائی کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ کیا بھید تھا؟ میں خوشی اور حیرت سے مغلوب ہو گیا۔ میں نے اپنی یہ

واردات سارے عزیزوں اور دوستوں کو سنائی۔ کسی نے مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھا اور کسی نے اسے میرا وہم قرار دیا۔ اباجی نے کہا کہ جو کچھ ہوا تھا اسے اپنے تک رکھنا تھا۔ تم اس اسرار کو برداشت نہیں کر سکے اس لئے اب آئندہ ایسے تجربے کی لذت سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ اور واقعی میں ایسے تجربے کی لذت سے محروم ہو گیا لیکن روحانیت سے میرا لگاؤ بڑھ گیا۔ میرے شکوک و شبہات ختم ہو گئے۔ میں نے اولیائے کرام کی زندگیوں میں ایسے تجربات کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا کہ ان کے مطالعہ کی بھی اپنی ایک لذت تھی۔

☯

پہلے تجربے کے پورے بیس سال بعد کل رات پھر ایک انوکھی واردات ہو گئی ہے۔ مجھے ایک ہفتہ سے انفیکشن کی شکایت تھی۔ جب گلا بالکل بیٹھ گیا تب ڈاکٹر کے پاس گیا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے بیماری کے ایک ہفتہ بعد آنے پر سرزنش کی پھر پنسلین کی گولیاں دیں۔ اس نے کہا کہ پورے سات دن تک صبح، دوپہر، شام باقاعدگی سے ان کے استعمال سے آرام آجانے کی امید ہے لیکن ان سات دنوں میں ایک وقت کی بھی بے قاعدگی نہ ہو۔ ڈاکٹر کی اتنی تاکید کے باوجود پہلے ہی دن میں شام کی گولی کھانا بھول گیا۔ کچھ دن بھر کی تھکن تھی کچھ سستی۔ اٹھنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ بار بار ارادہ کرتا کہ ابھی اٹھ کر گولی لے لیتا ہوں لیکن نیند مجھ پر حاوی ہوتی گئی۔ پھر یوں لگا جیسے کسی نے کیپسول نما پینسلین کی موٹی سی گولی میرے منہ میں ڈال دی ہے، میں بغیر پانی کے اسے نگلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور بالآخر نگل گیا ہوں۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو اس تجربہ کی حیرت اور خوشی میرے انگ انگ میں بھری ہوئی تھی۔ پورے بیس سال بعد میں نے کائنات کے عظیم تر اسرار کو یا شاید اس کی پرچھائیں کو پھر ہلکا سا چھوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری پینسلین کی گولیوں میں سے ایک گولی ضرور کم ہو گی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ گولیوں کو چیک کیا تو کوئی گولی کم نہیں تھی۔ اتنی ہی گولیاں تھیں جتنی رات کو سونے سے پہلے موجود تھیں۔ میری حیرت اور خوشی کچھ بجھنے لگی

لیکن ایک دم جیسے ان کی روشنی پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ گولیاں بے شک جوں کی توں تھیں لیکن میرا اسرار بھرا تجربہ بھی سچ تھا۔ ڈاکٹر نے جس انفیکشن کے خاتمہ کے لئے سات دن کی میعاد بتائی تھی وہ پہلے ہی دن ختم ہو چکی تھی۔ میر اگلا بالکل ٹھیک تھا۔ کہیں ہلکی سی خراش کا احساس بھی نہیں تھا۔ میں نے زور سے آواز دے کر اپنی بیوی کو بلایا اور اسے اپنے رات کے تجربہ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس دوران میرے بچے بھی آگئے تھے اور میرے قصے کو دلچسپی سے سن رہے تھے۔

جب میں اپنا تجربہ بیان کر چکا تب مجھے یاد آیا کہ مجھے تو اس بھید کو صرف اپنے تک رکھنا چاہئے تھا۔ اب مجھے اگلے تجربے کے لئے پھر بیس سال انتظار کرنا ہو گا۔ لیکن میں اب ۴۴ سال کا ہو چکا ہوں اور ۶۳ سال سے آگے جانے کی خواہش نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب ہے اب میں کسی اور روحانی تجربے سے آشنا نہ ہو سکوں گا۔

لیکن میں ۶۳ سال سے آگے جینے کی خواہش کیوں نہیں رکھتا؟

یہ بھی ایک بھید اور یہ بھید تو اب میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا۔

اعتراف

شہرِ جاں کی دیکھ کر یخ بستگی
خواہشیں تک ہم جلانے لگ گئے

آج میں آپ کو کوئی کہانی نہیں سناؤں گا۔ آج تو مجھے اپنی ایک اُلجھن کے بارے میں بتانا ہے۔ یہ اُلجھن کچھ اتنی زیادہ الجھی ہوئی بھی نہیں ہے۔ بڑی سیدھی سادی سی الجھن ہے۔ مجھے بچپن سے ہی مکھیوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی۔ اب سوچتا ہوں ممکن ہے بچپن میں مجھے کسی چھوٹی سی شہد کی مکھی نے کاٹ لیا ہو اور میں اسے بھی عام سی مکھی سمجھ کر مکھیوں سے الرجک ہونے لگ گیا۔ لڑکپن تک پہنچا تو میں نے دیکھا میرے کئی ہم عمر میز پر، کرسی کی ہتھی پر یا دیوار پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کو بآسانی مار لیتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی کئی بار دوستانہ ترغیب دی لیکن میں مکھی مارنے کے لئے کبھی بھی آمادہ نہ ہو سکا۔ میں نہیں کہہ سکتا میں مکھیوں سے خوفزدہ تھا یا مجھے ان سے کراہت محسوس ہوتی تھی یا میری الجھن کی کوئی اور وجہ تھی۔ میرے مسلسل انکار کے باعث میرے دوستوں نے مجھے بزدلی کا طعنہ دینا شروع کر دیا حالانکہ مکھی مارنا کہاں کی بہادری تھی کہ مجھے بزدل قرار دیا جاتا۔ اس کے باوجود میں نے کئی

بار کوشش کی۔ چھپ چھپا کر کوشش کی کہ ایک آدھ دفعہ کسی مکھی کو مار لوں تاکہ اس معاملے میں جھجک یا خوف جو کچھ بھی ہے کسی حد تک دور ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے ہم عمروں نے میرے بارے میں یہ جملہ گھڑ لیا "یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا"۔ جواباً میں نے انہیں مکھی مار کہنا تو شروع کر دیا لیکن اندر ہی اندر میری الجھن اور وحشت بڑھتی گئی۔ "یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا" یہ جملہ کسی گرز کی طرح مجھ پر برستا اور میں اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا اور پھر اپنی الجھن اور دوستوں کے طعنوں کے باعث میں نے بہادری کے متبادل تلاش کرنا شروع کر دیے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ میں نے تیرہ برس کی عمر میں جنس کے میدان میں پہلی فتح حاصل کر لی تھی۔ میں اپنی جرأت اور بہادری پر خود ہی حیران بھی تھا اور نازاں بھی۔

لڑکپن میں پھر کئی چھوٹی چھوٹی فتوحات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ میرے ہم عمروں کو بھی ان کی کچھ کچھ بھنک سی پڑنے لگی لیکن انہوں نے یہ کہنا نہیں چھوڑا کہ یہ تو مکھی بھی نہیں مار سکتا۔ ویسے ان کے لہجے سے اب طنز کی بجائے حسد کا اظہار ہونے لگا تھا اور اُن کا یہی حسد مجھے جیسے اپنے طاقتور ہونے کا احساس دلانے لگا تھا۔ جوانی تک پہنچا تو میں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ بھرپور جوانی تک میں اپنے میدان کا اسکندر اعظم بن چکا تھا جو اپنے دائرہ کار میں آدھی سے زیادہ دنیا فتح کر چکا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کو پلٹ کر دیکھا میرے سارے ہم عمر دوست بہت پیچھے رہ گئے تھے سوائے دو دوستوں کے۔ ایک جو شاعر تھا اور لندن میں کسی میم سے شادی کر کے وہیں آباد ہو گیا تھا۔ دوسرا حمید۔ حمید میرا ہم رکاب تھا لیکن کسی ایسے جانور کی طرح جو شیر کے شکار کا "جوٹھا" ملنے کی امید میں حریص نظریں گاڑے بیٹھا ہو۔ لیکن اس شیر کے اپنے کچھ اصول تھے۔ چنانچہ حمید جب مجھ سے بالکل مایوس ہو گیا تو وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ جب وہ جانے لگا تو مجھے ایسے لگا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا ہو تم کہاں کے اسکندر اعظم ہو۔ تم تو مکھی بھی نہیں مار سکتے۔ اور میں اندر ہی اندر مزید ٹوٹنے لگا۔

میں نے ادھیڑ عمری میں بھی جوانی کے مزے لوٹے ہیں لیکن بڑھاپے میں اپنی باگیں اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھما دیں۔ جنس کے معاملے میں میرے اپنے اصول ہیں۔ کسی سے زبردستی ظلم ہے لیکن اگر میاں بیوی راضی ہوں تو قاضی کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ قاضی زیادہ مداخلت کرے تو بھگوان کو ساکھشی مان کر کام چلا لیجے اس طرح قاضی سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے ہمیشہ دوستی بڑھا کر اور اپنی دوست کو رضامندی سے بھی آگے راضی بہ رضا کے مقام پر لا کر جھک ماری ہے۔ کبھی کسی سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ دھوکہ نہیں دیا۔ دو قدم کا ساتھ ہے، عمر بھر کا نہیں ہے۔ اصل میں جھوٹ، دھوکہ دہی، بلیک میلنگ، فریب کاری یہ سارے جوہر تو آج کے زمانے میں اخلاقیات اور سیاست کے نمبرداروں نے اپنا رکھے ہیں۔ بہرحال میری صاف گوئی یا حماقت کا اندازہ اسی بات سے کر لیں کہ میں نے اپنی بیوی سے اپنی کوئی فتح پوشیدہ نہیں رکھی حالانکہ ایسے معاملات کا بھلے ساری دنیا کو علم ہو جائے صرف بیوی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔

مجھے اپنی ساری زندگی میں صرف دو دفعہ شدید پچھتاوا ہوا ہے۔ ایک دفعہ تب ہوا جب میرے بچپن کے دوست اور لندن میں مقیم شاعر کی میم بیوی میرے پیچھے پڑ گئی۔ اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا دوست جنسی لحاظ سے ناکارہ ہو گیا ہے اور اب نوجوان لڑکوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنا OBJECTIV گذارہ کر رہا ہے۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں مجھے دوست کا لحاظ مار گیا۔ میں نے اپنی جھولی میں خود بخود آ کر گرنے والے پھل کو اٹھا کر اپنے دوست کی فرج میں رکھ دیا۔ اپنی اس شرافت پر میں آج بھی شرمندہ ہوں۔ مجھے اس میم کو مایوس نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دوسری دفعہ مجھے اس وقت پچھتاوا ہوا جب لاہور کی ایک بُری عورت کی خواہش میں نے پوری کر دی۔ مجھے اس عورت کی صورت کسی مکھی کی طرح لگنے لگی ہے اسی لئے میرے پچھتاوے میں کراہت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے یہ باتیں بھی اپنی بیوی کو بتا دی تھیں۔

بیوی سے یاد آیا۔ میرے نانا جی اور تایا جی کو بڑھاپے میں نئی بیوی لانے کا بہت

شوق تھا۔ ان بے چاروں کے شوق تو پورے نہ ہوئے البتہ بڑے ماموں نے ستر سال کی حد پار کرنے کے بعد بھی بازی جیت لی۔ لوگوں نے بہت بکواس کی۔ ان کے بڑے بیٹے کی بیوی نے کئی برس پہلے علیحدگی اختیار کر لی تھی لوگوں نے اسے ہی جواز بنالیا: وہ بے چارہ ابھی تک دوسری شادی نہیں کر سکا اور اس بوڑھے کو دیکھو بیٹے کا رشتہ کرانے کی بجائے خود شادی رچا بیٹھا۔ مولوی مولوی ہوتا ہے چاہے کسی مسلک کا ہو۔ اپنی بیٹی کی ہم عمر عورت سے شادی رچا بیٹھا ہے اور اب دین سے اس کی سند اور جواز پیش کر رہا ہے۔ ارے ایک بیٹی بھی تو بیوہ ہے اس کی۔ اگر دین کا اتنا ہی پاس تھا تو پہلے اپنی بیوہ بیٹی کا کہیں رشتہ کراتا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ پر مجھے اپنے ماموں کی یہی ایک خوبی تو بھائی تھی۔ بہتر سال کی عمر میں شادی۔ جیو بڑے ماموں زندہ باد!

صاحبان! اس وقت میں اسی برس سے اوپر کا ہو گیا ہوں۔ اب اس عمر میں کہاں تک جھوٹ بولوں۔ لیجئے آپ کو سچی بات بتا ہی دوں۔ حمید نامی کوئی شخص کبھی بھی میرا دوست نہیں رہا۔ میرے اندر ساٹھ سال تک تو بہر حال جنس کا طوفان سا مچا رہا لیکن یہ طوفان کبھی بھی کناروں سے باہر نہیں آیا۔ میری فطرتی بزدلی نے میرے کناروں کو بہت بڑے بند میں تبدیل کر دیا تھا۔ میری جنسی فتوحات کی ساری کہانیاں میری خواہشات کا لفظی بیان تھیں اور بس۔ اس لفظی بیان کی جادوگری کام کرتی رہی مجھے بزدل کہنے والے مجھے حسد بھری نظروں سے دیکھتے اور جل کر من ہی من میں کہہ دیتے ہونہہ یہ مکھی بھی نہیں مار سکتا۔ اب وہ سارے دوست مر کھپ چکے ہیں تو پھر مزید جھوٹ بولنے سے فائدہ۔ یوں بھی جنس کا طوفان تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔ اب تو میرے اندر اور باہر برف ہی برف ہے۔ (پر یہ "خواہش" ابھی تک کیوں نہیں مری؟)

ابھی ابھی ایک انوکھی بات ہو گئی ہے۔ ہلکی سی دھپ کی آواز کے ساتھ دو جڑی ہوئی مکھیاں میرے میز پر آن گری ہیں۔ ان کے "طرزِ عمل" سے مجھے علم ہو گیا ہے کہ ایک نر ہے اور ایک مادہ۔ میں نے کسی وحشت یا کراہت کے بغیر انہیں دلچسپی سے دیکھا ہے۔ کاش

میرے سارے بچپن کے دوست اس وقت زندہ ہوتے اور یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔
میں نے اخبار اٹھا کر اسے تھوڑا سا فولڈ کیا ہے اور اس کے ایک ہی وار سے نر اور مادہ دونوں مکھیوں کو "دورانِ عمل" ہی ختم کر دیا ہے۔

بابا جمالی شاہ کا جلال

وادیٔ حیرت میں حیدؔر دیکھ لو
سارے فرزانے ٹھکانے لگ گئے

جو کچھ جیلے کے ساتھ ہو گیا ہے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!

لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اس پر اور اس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

مولوی عطاالرحیم پہلے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں کی چھوٹی سی مسجد میں نمازیں پڑھاتے، گاؤں والوں کو خدا، رسول کی باتیں سناتے۔ گاؤں والوں کو اُن کی باتیں سمجھ میں آتیں یا نہ آتیں لیکن سارے لوگ اُن کی بہت عزت کرتے۔ حالات نے پلٹا کھایا تو وہ گاؤں سے شہر آگئے۔ یہاں ترقی کرتے کرتے وہ شہر کی جامع مسجد کے امام بن گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہلے موٹر سائیکل، پھر کار اور آخر کار پجارو کے مالک بن گئے۔ اب اُن کا رعب دبدبہ بھی بہت ہو گیا تھا۔ ہر شعبہ حیات کے لوگ اُن کی خوشامد کرتے۔ ان کے آگے آنکھیں

بچھاتے چلے جاتے۔ لوگوں کی خوشامد اور دولت کی ریل پیل نے انہیں وسیع المشرب اور راسخ العقیدہ عالم کی جگہ متعصب اور کٹڑ پن کا شکار مولوی بنا دیا تھا۔

اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ جیلے کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں شاید تھوڑا سا میرا بھی قصور ہے۔ میں نے ایک دفعہ اسے ایک مجذوب کا قصہ سنایا تھا۔ مغلیہ دور میں جب ایک اہم مغل بادشاہ کی تیار کرائی ہوئی عالی شان مسجد میں پہلی نماز ہونے لگی تو ایک مجذوب بھی نماز کے مقتدیوں میں شامل ہو گیا۔ مغلوں کے مقرر کردہ امام نے نماز شروع کی تو اُس مجذوب نے بلند آواز میں کہا: جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔ مغل بادشاہ ان کے سرکاری امام اور سارے درباریوں کو مجذوب کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ نماز کے بعد اس مجذوب کو ڈانٹا گیا تو اُس نے بڑی سادگی سے کہا میرے قدموں کے نیچے کی زمین کھود کر دیکھ لو، میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے اسی وقت وہاں کھدائی کی گئی تو ایک تھیلی برآمد ہوئی جس میں سونے ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔ سب لوگ اس واقعہ پر ابھی حیران ہی تھے کہ اس مجذوب نے کہا:

> نماز شروع کرتے ہی امام نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ شاہی مسجد کی پہلی نماز پڑھا رہا ہوں۔ ظل الٰہی بہ نفس نفیس حاضر ہیں۔ کم سے کم سونے کی ایک ہزار اشرفیاں تو ضرور انعام میں عطا کریں گے۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ جو کچھ امام کے دل میں ہے وہ میرے قدموں میں ہے۔

جب میں نے جیلے کو یہ قصہ سنایا تھا اس کی آنکھوں میں معصومانہ حیرت تھی۔ پھر وہ مجھ سے وقتاً فوقتاً صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے حالات پوچھتا اور سنتا رہتا۔ پھر کہیں ایک دن اس نے اپنے باپ مولوی عطاالرحیم کے سامنے بھی چند قصے دہرائے تو مولوی عبدالرحیم بھڑک اٹھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا بیٹا اس حد تک "گمراہ" ہو چکا ہے۔ انہوں نے بڑی مہارت سے جیلے کو کنٹرول کیا۔ چنانچہ ایک مختصر سے وقفہ کے بعد میری جیلے

سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے مولوی باپ کے عطا کردہ علم کے باعث اپنی معصومیت اور حیرت کھو چکا تھا۔ اب وہ مجھے بتا رہا تھا کہ یہ سب مجذوب فقیر ڈھونگی ہوتے ہیں۔ اولیاء کو مجذوبوں کے ساتھ نہیں ملانا چاہیے۔ پھر وہ مجھے تصوف کی تعریف اور اس کے بعض مراحل کی بابت بتانے لگا جو ظاہر ہے مولوی عطاالرحیم نے اپنے کچے پکے علم کی بنیاد پر اسے رٹا دیا تھا۔ میں نے اسے توجہ دلائی کہ تصوف کے بارے میں جاننا اور صوفیانہ تجربے سے گزرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن میری بات اب جیلے کی نظر میں بیچ نہیں رہی تھی۔ الٹا وہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ مغلیہ دور کے امام سے الجھنے والا مجذوب دراصل ملحد تھا۔ پورا کلمہ نہیں پڑھتا تھا اسی لئے اسے قرآن و سنت کی روشنی میں قتل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ اس مجذوب کی شہادت میں مذکورہ امام کی سازش شامل تھی جس نے اپنی سُبکی کا بدلہ لینے کے لئے مذہبی عقائد کا ڈرامہ کیا تھا۔ بس اسے اتنی نصیحت کر دی کہ وہ کسی بھی مسلک پر کاربند رہے لیکن کبھی کسی مجذوب فقیر سے نہ الجھے۔

بابا جمالی شاہ شہر کے درمیان میں واقع قبرستان میں ہی اکثر دیکھے جاتے تھے۔ کبھی کبھار شہر کی سڑکوں پر بھی اپنی دُھن میں جاتے نظر آ جاتے تھے۔ کسی کی دعا کی درخواست قبول کرنا ان کے موڈ پر منحصر تھا لیکن جس کی دعا کی درخواست قبول کرتے فوراً ہاں یا نہ میں جواب دے دیتے تھے۔ خود میں نے اپنے دسویں کے امتحان کے بعد ان سے کہا تھا کہ جمالی بابا دعا کریں میں دسویں میں پاس ہو جاؤں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ ان کے بے آواز ہونٹ تھوڑی دیر کے لئے ایسے ہلے جیسے خدا سے دعا کر رہے ہوں پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر کہا: جا بچہ۔ تو پاس ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے خیال آگیا کہ فرسٹ ڈویژن بھی مانگ لوں۔ چنانچہ میں نے جمالی بابا سے پھر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کی دعا کے لئے بھی کہہ دیا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا پھر اسی طرح بے آواز ہونٹ ہلانے لگے۔

جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو اُن میں مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگے یہ دعا بھی پوری ہوئی۔ قدرت خدا کی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ تاہم کسی کی دعا کی درخواست سننا بابا جمالی شاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔ عموماً وہ بڑے لوگوں کی درخواست پر دھیان نہیں دیتے تھے۔

ایک بار علاقے میں بارشیں نہیں ہوئیں۔ فصلوں کے نقصان اور قحط کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ تب مولوی عطاء الرحیم نے ایک دن پہلے سارے شہر میں نماز استسقاء کے لئے اعلان کرایا اور اگلے دن بڑی عید گاہ میں نماز استسقاء پڑھائی، لیکن بے سود۔ لگ بھگ ایک ہفتے کے بعد بعض غریب غرباء بابا جمالی شاہ کے پاس بارش کی دعا کرانے کے لئے گئے۔ بابا جمالی شاہ نے اپنے معمول کے مطابق آنکھیں نہیں موندیں۔ مزاروں سے کھجور کی چند چھڑیاں اٹھائیں اور سڑک پر آگئے۔ انہوں وہ چھڑیاں زور زور سے سڑک پر مارنا شروع کر دیں۔ سڑک پر دو تین بار چھڑی مارنے کے بعد ایک بار آسمان کی طرف منہہ اٹھا کر دیکھتے اور پھر جیسے ڈانٹنے کے انداز میں کہتے: "اوئے! مینہہ برساتا ہے یا نہیں؟۔ میں کہتا ہوں مینہہ برساؤ"

میرا خیال ہے کہ ہر بندے کی خدا کے ساتھ تعلق کی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔ خدا تو اندر کے سارے بھید جانتا ہے۔ وہ کسی کی عاجزی میں بھی ریاکاری کی بو پائے اور اسے دھتکار دے اور کسی کی بے ادبی جیسی بے تکلفی میں بھی محبت کی خوشبو پائے اور اس کے ناز اٹھالے۔ بابا جمالی شاہ ساری چھڑیاں سڑک پر مار مار کر توڑ چکے تو پھر قبرستان واپس چلے گئے لیکن سارے شہر نے دیکھا کہ گھنگھور گھٹائیں اُمڈی چلی آرہی تھیں۔ پھر ایسی برسات ہوئی کہ قحط کے سارے خوف ڈھل گئے۔

ویسے تو مولوی عطاالرحیم اس واقعہ کے بعد سے ہی بابا جمالی شاہ کے سخت خلاف ہو گئے تھے لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک بار مولوی صاحب کو رات کی تاریکی میں بابا جمالی شاہ کے پاس جاتے دیکھا تھا۔ شاید مولوی صاحب نے انہیں دعا کی درخواست کی ہو اور بابا جمالی شاہ نے انہیں جواب ہی نہ دیا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد پتہ چلا کہ مولوی عطاالرحیم کی رپورٹ پر بابا جمالی شاہ کو پڑوسی ملک کے لئے جاسوسی کرنے کے الزام میں

گرفتار کرلیا گیا ہے لیکن گرفتاری کے تیسرے ہی روز پتہ چلا کہ بابا جمالی شاہ پر تشدد کرنے والا چھوٹا تھانے دار پاگل ہو گیا ہے اور تھانے کے عملہ نے خوفزدہ ہو کر بابا جمالی شاہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مولوی عطاء الرحیم کے غیض و غضب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ان کے اشارے پر ان کے بیٹے جیلے نے بہت سارے بچوں کو ٹافیوں کا لالچ دے کر وقتاً فوقتاً بابا جمالی پر پتھراؤ کرنے اور انہیں پاگل پاگل کہنے کی ڈیوٹی پر لگا دیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسے مجذوبوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے لیکن وہ بابا جمالی شاہ کو کوئی بہت بڑا چالباز اور مکار قرار دے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بابا جمالی شاہ مسمریزم کا عمل جانتا ہے اسی لئے تھانے والوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

آج بعد نماز عصر نوجوانوں کا ایک گروہ ایک جنازہ اٹھائے ہوئے بابا جمالی شاہ کے پاس پہنچا تھا۔ یہ سارے لڑکے جیلے کے دوست یا واقف کار تھے۔ میت کے طور پر جیلا لیٹا ہوا تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ پہلے بابا جمالی سے کہیں گے کہ ایک میت ہے اس کا جنازہ پڑھا دیں۔ جب بابا جنازہ پڑھا دیں گے تو پھر سب مل کر بابا کا مذاق اڑائیں گے۔ اس پروگرام کا روحِ رواں جیلا تھا اسی لئے وہ خود میت بنا پڑا تھا۔ لڑکوں نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ بابا جمالی شاہ سے کہا کہ یہ ایک میت ہے اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں۔ بابا نے نماز جنازہ پڑھانی شروع کر دی حالانکہ پیچھے کوئی صف بھی نہیں بنی تھی، نہ ہی کوئی اور نماز جنازہ میں شریک تھا، بابا جمالی اکیلے ہی لگے ہوئے تھے، جب انہوں نے آخری سلام پھیرا تو لڑکوں نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے اور کہنے لگے: بابا جمالی! یہ تو مولانا عطاء الرحیم کا بیٹا جیلا ہے اور زندہ ہے۔

تب بابا جمالی شاہ نے بڑے جلالی انداز میں کہا:

یہ جو کوئی بھی تھا اب صرف قیامت کے دن ہی اٹھے گا کیونکہ اس کا جنازہ جمالی شاہ نے پڑھا دیا ہے۔

تمام حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جیلا واقعی مر چکا تھا۔

جو کچھ جیلے کے ساتھ ہو گیا ہے کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!
لیکن اس کی ساری ذمہ داری خود اس پر اور اس کے سخت دل مولوی باپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

مسکراہٹ کا عکس

روشنی کا استعارہ کرلیا
دل نے ہر آنسو ستارہ کرلیا

ایک بہت بڑے فریم میں اباجی کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگا کے میں نے فریم کو اپنے ڈرائینگ روم میں آویزاں کرر کھا ہے۔ گھر کے باقی کمروں میں بھی ان کی چھوٹی چھوٹی تصویریں سجا رکھی ہیں اور یہ ساری تصویریں میرے من میں بھی بجی ہوئی ہیں۔ گو انہیں فوت ہوئے ایک زمانہ ہو گیا ہے لیکن ان تصویروں کے باعث مجھے گھر میں ان کی موجودگی کا گمان رہتا ہے۔ ڈرائینگ روم والی بڑی تصویر اس لحاظ سے باقی ساری تصویروں سے الگ ہے کہ اس میں اباجی کے چہرے پر ولیوں جیسی شان بے حد نمایاں ہے۔ میک اپ کر کے اپنے چہرے پر نور ظاہر کرنے والے نام نہاد مقدس لیڈروں سے مختلف، اپنے اندر کی روشنی سے منور اباجی کا چہرہ۔ اور پھر اس چہرے میں دو جگمگاتی آنکھیں۔ ان جگمگاتی آنکھوں میں عجب اسرار ہیں۔ میں کبھی کوئی بہت اچھا اور نیکی کا کام کرتا ہوں تو اباجی کی آنکھوں میں خوشی کی

چمک دکھائی دیتی ہے۔ میں سب سے بچ بچا کر اور چھپ چھپا کر بھی کوئی برا کام کر بیٹھوں تو اباجی کی آنکھوں سے برہمی بلکہ تادیب کی لو بھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔

کسی نے مجھ سے زیادتی کی۔ میں نے اس سے برابر کا بدلہ لے لیا اباجی کی آنکھوں کی اداسی جیسے بولنے لگتی ہے: اس نے تمہیں دُکھ پہنچایا، بُرا کیا۔ تم نے فوراً بدلہ لے لیا۔ کیا مل گیا بدلہ لے کر؟ کبھی دکھ کو سہہ جانے کا مزہ بھی چکھ کر دیکھو!

بعض بھائیوں نے میرے ساتھ ہاتھ کیا، میں نے انہیں سبق سکھانا چاہا تو اباجی کی دکھ سے بھری آنکھیں مجھے نصیحت کرنے لگیں: تم سارے بھائی میرے ہی وجود کی شناخت ہو۔ وہ چھوٹے ہیں، نادان ہیں۔ انہیں نقصان پہنچاؤ گے تو وہ بھی تمہارا نقصان ہو گا۔ تم جیتو یا ہارو، دونوں صورتوں میں خود ہی ہارو گے اور مجھے ہی ہراؤ گے۔

کبھی کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میں ٹین ایج میں ہوں اور اباجی ہمہ وقت جا، بے جا مداخلت کر کے مجھے اپنے بنائے ہوئے سیدھے رستے پر چلائے رکھنا چاہتے ہیں اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ فریم میں اباجی کی تصویر نہیں، ایک آئینہ ہے۔ میں اس کے روبرو ہوتا ہوں تو گویا اپنے روبرو ہوتا ہوں۔ مجھ پر میرے اندر سے اچھائی اور برائی کا فرق منکشف ہونے لگتا ہے۔ نیکی اور خیر کی تحریک ملنے لگتی ہے۔

ایک بار میں نے اپنے تینوں بیٹوں کی اباجی کے ساتھ تصویر کھینچی تھی۔ ٹیپو، اباجی کی گود میں تھا اور زلفی، شازی اُن کے دائیں، بائیں۔ مدت کے بعد اس تصویر کو دیکھا۔ میں تصویر میں موجود نہیں تھا لیکن میں نے ہی تو تصویر کھینچی تھی، سو اس تصویر میں اپنی موجودگی، اپنی شرکت کا احساس جاگا۔ اپنے تینوں بیٹوں اور اباجی کی گروپ تصویر کو دیکھ کر میں جیسے درجۂ شہود میں داخل ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود میں میرے ماضی، حال اور مستقبل۔ تینوں زمانے یک جا ہو گئے ہیں۔ سارا زمان ایک نقطے میں ڈھل گیا ہے۔ شاہد و مشہود کی تفریق ختم ہو گئی ہے۔ لیکن اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اباجی مجھے روکتے، ٹوکتے کیوں رہتے ہیں؟۔ تب ہی نقطۂ زماں پھیلنے لگا اور میں اپنے لڑکپن سے جوانی کے دور میں

داخل ہونے لگا۔ ہر نصیحت سے غافل اور بیگانہ۔ خواہشات کا اژدہام تھا اور میں تھا۔ میں منزلوں پر منزلیں مار رہا تھا۔ خواہشات کی نوعیت بدلتی گئی، عمر ڈھلتی گئی لیکن خواہشیں جہنم کی طرح ھل من مزید پکارتی رہیں۔ بے شک انسان حریص ہے کہ اسے سونے کا پہاڑ مل جائے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے ویسے ہی ایک اور پہاڑ کی خواہش کرنے لگے گا۔ خواہش کے جہنم کا کوئی انت نہیں ہے، اس سے نکل آنے میں عافیت ہے۔ اور پھر میں اپنے گوتم کے پاس آگیا۔ خواہشوں کے جہنم سے نکل آنے کے بعد اباجی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں بیک وقت خفگی اور خوشی کا تاثر تھا:

"خواہش پوری ہونے پر تسکین نہیں ہوتی بلکہ حرص کا روپ دھار لیتی ہے۔ جتنی خِواہشیں پوری ہوتی جاتی ہیں اتنا ہی حرص بڑھتا جاتا ہے۔ یہ پیاس اور یہ آگ کبھی بھی نہیں بجھتی۔ خواہشیں بے انت سراب کی ٹھاٹھیں مارتی لہریں ہیں!"

"اباجی! میں جوگی نہیں ہوں۔ صوفی اور تیاگی نہیں ہوں۔ ان سب کی جی جان سے عزت کرتا ہوں لیکن ان جیسا بننا نہیں چاہتا، میں آپ جیسا ہی بننا چاہتا ہوں۔ زندگی کو بھوگتے ہوئے اپنی ریاضت، اپنی تپسیا مکمل کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ کے برعکس میری خواہشیں، حرص میں ڈھلنے لگتی ہیں اور میری ساری ریاضت برباد ہو جاتی ہے، ساری تپسیا بھنگ ہو جاتی ہے۔ اور اباجی! آپ نے مجھے کبھی قناعت کا درس نہیں دیا تھا۔ شاید اسی لئے خواہشوں کو مکمل طور پر تیاگ دینا میرے لئے ممکن نہیں ہے"

یہاں تک بات کرتے کرتے میری آنکھوں کا پانی پلکوں تک آگیا تھا۔ پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسوؤں نے سارا منظر دھند میں لپیٹ دیا تھا۔ لیکن یہ کیا؟

دراصل ہمارے اندر کی دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ باہر کی، ظاہر کی دنیا سے یہ سب کچھ الگ تھلگ ہوتا ہے۔ اپنے اندر کی دنیا میں مگن رہنے کے باوجود میں اندر اور باہر کی دنیاؤں کے اس فرق کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ اباجی کی تصویر سے میرے تعلق کی نوعیت بھی حقیقتاً داخلی تھی۔ ظاہر کی دنیا کے حساب سے تو شاید ایسا کچھ

بھی نہیں تھا لیکن میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بھی پوری طرح دیکھا تھا کہ اباجی سچ مچ تصویر کے فریم سے باہر نکلے، اور صوفے پر آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ اپنی پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے۔ لیکن آنسو تو امڈتے ہی چلے آتے تھے۔ جیسے سیلاب بن کر خواہشوں کے اژدہام کو بہالے جانا چاہتے تھے۔ تب اباجی نے بیٹھے ہی بیٹھے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا۔ شاید وہ بول نہیں سکتے تھے اور اسی طرح مجھے دلاسہ دے رہے تھے۔ پگڑی کی لڑ سے میرے آنسو صاف کئے جانے اور اباجی کا مجھے خود سے لپٹانے کا میرا تجربہ خیالی یا روحانی قطعاً نہیں تھا۔ یہ مکمل طور پر جسمانی اور ظاہری وقوعہ تھا۔

میں نے آنکھوں کو اچھی طرح صاف کیا اور آنسوؤں کی دھند کو ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میرے تینوں بیٹے میرے پاس تھے۔ ٹیپو نے مجھے بانہوں میں بھینچ رکھا تھا، شازی میرا کندھا دبا رہا تھا سامنے زلفی کھڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں بھیگا ہوا رومال تھا۔

"اباجی! آپ ٹھیک تو ہیں؟

آپ کو بیٹھے بیٹھے کچھ ہو گیا تھا۔ کیا ڈاکٹر کو بلالیں؟" پتہ نہیں تینوں بیٹوں میں سے کون بول رہا تھا۔

مجھے ایسے لگا جیسے اباجی کے ساتھ میرے داداجی اور پرداداجی بھی میری عیادت کے لئے آئے ہوئے ہیں اور میرے پوتے اور پڑپوتے بھی میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ زمان کو پھر ایک نقطے میں سمٹتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی۔ میں نے سامنے ٹنگی ہوئی اباجی کی تصویر کی طرف دیکھا تو اُن کے ہونٹوں پر بھی مجھے اپنے جیسی مسکراہٹ دکھائی دی۔ بجھتی، چمکتی مسکراہٹ۔

پتہ نہیں اباجی کی تصویر کے ہونٹوں پر میری مسکراہٹ کا عکس تھا یا میرے ہونٹوں پر اباجی کی مسکراہٹ کا عکس تھا!

تاثرات

حیدر قریشی بظاہر ادب کی کئی اصناف میں ایک طویل عرصے سے تخلیقی کام کر رہے ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ افسانے کے دیار میں قدم رکھتے ہیں تو فطرت اپنے اسرار کی گتھیاں اُن پر باندازِ دگر کھولتی ہے۔۔۔۔اُن کا شمار ساتویں دہے کے اُن افسانہ نگاروں میں کرنا مناسب ہو گا جو تجریدیت سے معنی کا نیا مدار طلوع کرتے ہیں اور سوچ کو نئی کروٹ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید

حیدر قریشی کے یہاں ایمان کا کراماتی عمل کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ایمان زندہ رہے تو معجزوں کا رونما ہوتے چلے جانا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔حیدر قریشی کے ایمان کی توانائی اسے انہدام کی ہیبت سے محفوظ رکھتی ہے۔نہ صرف یہ، بلکہ اسے انہدام کے انہدام کا پورا یقین ہے اور اس قیامت کا نظارہ کرنے کے لئے وہ اپنی آنکھیں وا کیے ہوئے ہے۔ہر چہ بادا باد۔۔۔۔حیدر قریشی اس وسیع تر زندگی کی دریافت کے لئے اپنی کہانیاں تخلیقتا ہے۔اپنے اس کھلے کھلے راستے کو طے کر کے اسے دُور یا نزدیک کسی شیشے کے محل میں اقامت نہیں اختیار کرنا ہے بلکہ راستوں سے راستوں تک پہنچتا ہے اور ہر راستے پر تباہ حال زندگی کی باز آبادکاری کیے جاتا ہے۔

جوگندر پال

حیدر قریشی نے ان افسانوں کے ذریعے کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس سچائی کو نمایاں کیا ہے کہ Limit Situation کے دوران انسان صرف کرب ہی کی نمائندگی نہیں کرتا اور نہ اس کا وجود ہی پاش پاش ہوتا ہے بلکہ اس کے نطق سے اس کی اپنی تاریخ گفتگو کرتی ہے۔ ہمارا افسانہ تاریخ کے اس مکالمے سے شاید اب تک غافل تھا۔ حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کی راہ سے تاریخ کے اس مکالمے کو سننے کی سعی کی ہے۔۔۔۔ حیدر قریشی کے افسانے ایک نئے طریقے سے قاری تک پہنچتے ہیں اور ان کی گفتگو کا لہجہ بھی مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ان افسانوں میں ایک ایسا رویہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

جیلانی کامران

حیدر قریشی تاریخ کے جھروکے میں جھانکتے ہیں، تہذیبوں کی سرحدوں کو عبور کرتے ہیں، مذہبی صحیفوں کی نظریاتی اور روحانی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ انسان کی روح میں اترتے ہیں، اس کے دل کو بلوتے ہیں، اس کے تصوّر کے ساتھ اُڑان بھرتے ہیں اور جسم کی لذّت سے بھی آشنا ہوتے ہیں اور یوں کہانیاں روپ بدل بدل کر شیشہ گھر میں اُترتی چلی جاتی ہیں۔ حیدر قریشی کی کہانیوں کی دُنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے، سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔۔۔۔ ایسی کہانیوں میں اسے نوع کا سچ نہیں ہے جسے اکثر ہم مجسّم کائناتی سچ، سماجی سچ یا نام نہاد بھوگا ہوا سچ کہتے ہیں کیونکہ ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے، روح کا سارا آکاش ہے، جسم کی حدوں کو توڑتا ہوا تفکّر اور قوتِ متخیلہ ہے۔ انسان اپنی کل ثقافت، جامع تاریخ، اپنے تمام گناہ و ثواب کی پونجی لئے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر جا رہا ہوں؟۔۔۔۔ دراصل غور کیا جائے تو حیدر قریشی کی کہانیاں کائناتی انسان۔ خدا۔ روح۔ ثقافت اور ثقافتی وراثت کے ازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔ ایسی

کہانیاں اُردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ کسی ایک مصنف کے ہاں ایسی ایک دو کہانیاں نظر آجائیں گی لیکن کوئی ایک ہی مصنف ان ازلی سوالوں، نظریات اور حسیات سے جھوجھتا رہے، ایسا کوئی دوسرا کہانی کار میری نظر میں نہیں ہے۔۔۔ حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں۔

دیویندر اِسر

کہانیاں علامتی ہیں لیکن معاصر کہانیوں سے الگ اور انوکھی۔ یہاں تاریخ گنگناتی ہے۔ انسانی تہذیب سرگوشیاں کرتی ہے اور ان کی کوکھ سے آج کے جلتے ہوئے مسائل پھنکارتے ہوئے نکلتے ہیں۔۔۔ پُرکشش کہانیاں جو سوچنے پر اکساتی ہیں۔ حیدر قریشی تجرید کو رنگین بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس

میں ذاتی طور پر حیدر قریشی کو جدید تر افسانوی میدان میں کامیاب و کامران سمجھتا ہوں۔ اُن کا یہی انداز توازن اور تناسب کے ساتھ برتا جائے تو وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھیں گے اور وہ حضرات جو جدید اور جدید تر افسانے کے باب میں شاکی ہیں، اطمینان حاصل کرلیں گے۔

پروفیسر حمید سہروردی

حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کرکے ایک ایسا آئنہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بیشتر کہانیوں میں میجر کردار خود کہانی کار کی ذات ہوتی ہے اور اس طرح حیدر قریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر رائے بھی دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا، اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

حیدر قریشی کی کہانیاں زمینی زندگی کے معمولی واقعات سے شروع ہوتی ہیں جنہیں فلوبیئر کے لفظوں میں Slices of Life کہا جاسکتا ہے مگر اُن میں جلد ہی مذہبی، عقیدتی اور روحانی رنگ بکھرنے لگتا ہے اور اُن کی اُٹھان عمودی ہو جاتی ہے۔ پھر اُن کہانیوں کی فضا زمین اور آسمان کے بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اکثر کہانیوں کا اسلوب داستانی معلوم ہوتا ہے لیکن لہجہ کا دھیماپن، علامتوں، تمثیلوں اور تلازمے کا استعمال انہیں داستانی رنگ سے الگ بھی کرتا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی عقائد کا اظہار بھی ہوتا ہے مگر جمالیاتی طور پر اُن میں نہ کوئی خطابیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کسی آئیڈیل یا انفرنل دُنیا میں داخل ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔ حیدر قریشی کی کہانیوں میں زبان اور حوالہ جات اُس وقت، زمانے اور علاقے کی حدوں کا تاثر ضرور دیتے ہیں جب اور جہاں اُن کی کہانیوں نے جنم لیا کیونکہ اس سے کسی تخلیق کار کو مفر نہیں، لیکن اُن کہانیوں کا مجموعی سپکٹرم زمان اور مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور دُنیا کے کسی بھی حصے کا قاری اُن کہانیوں میں امکانی سچائی کو دیکھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی

روشنی کی بشارت حیدر قریشی کے افسانوں کا وہ مجموعہ ہے جو آج کے نئے افسانے پر اُن تمام الزامات کو رد کرتا ہے جن کے تحت جدید افسانے میں بے ربط، منتشر اور مبہم احساسات کو ایسی شاعرانہ زبان میں پیش کرنے کا چلن ہو گیا ہے جو ہذیان گوئی سے قریب ہے۔ ہمیں ان افسانوں میں مصنّف نے اس حقیقی روشنی کی بشارت دی ہے جو ہر عہد میں انسان کو سچا راستہ دکھاتی رہی ہے اور جو آج بھی انسان کے ضمیر کا اُجالا بن کر روشن ہے۔

ڈاکٹر ذکاءالدین شایاں

حیدر قریشی کے افسانے میں تجربے کا نقش ہے، مشاہدے کی بار یکی ہے، زندگی کے فلسفے کی جھلک ہے اور اشارات و کنایات ہیں، ساتھ ہی تفہیم کی فکر نمایاں ہے۔ بیانات قاری یا سامع کو ایک طرح کی خود اختیاری سچویشن میں لا کر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ حالات سے اثر کو تلاش کرے۔ یہ خود اختیاری (Option) کی صورت پرانے افسانہ نگاروں کے ابلاغ سے الگ ہے اور جدیدیوں کے خود میں گم ہو جانے والی ترکیب (Device) سے جدا ہے۔ اس طرز میں نہ غصہ ہے، نہ جھنجھلاہٹ، نہ الزام تراشی، بس ایک گہرا تاثراتی بیان ہے جو ذہن کے خانوں سے ہوتا ہوا واقعات میں پھیل جاتا ہے....

حیدر قریشی اپنے افسانوں میں بے راہ روی کا شکار کبھی نہیں رہے۔ انہوں نے اعتدال پسندی پر توجہ مرکوز رکھی ہے اور موضوع، اسلوب، تیکنیک، زبان اور مواد۔ ہر لحاظ سے نیا پن اور نئی آویزشوں کے مابین زندگی کی حرارت اور بو قلمونی پیدا کی ہے.... حیدر قریشی نے اپنے افسانوں میں ان وسعتوں کی دریافت کی ہے جہاں سے قدروں کے سرچشمے قریب نظر آتے ہیں انسانی ذہن ہمہ وقت وجدان حاصل کرتا ہے اور یہ وجدان اس وقت فن بنتا ہے جب فنکار کا ذہن اسے مکمل اظہار کی صورت بخشتا ہے۔ حیدر قریشی اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے بیشتر مظاہر کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں اسی لئے اُن کے یہاں زمینی خوشبو، عصری تازگی، نئے تخلیقی رویّہ اور برتاؤ کی توانائی ملتی ہے۔ حیدر قریشی اپنے افسانوں میں نئے موضوعاتی پھیلاؤ کے ذائقوں، رنگوں اور پہلوؤں کو سمونے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی